الاؤ

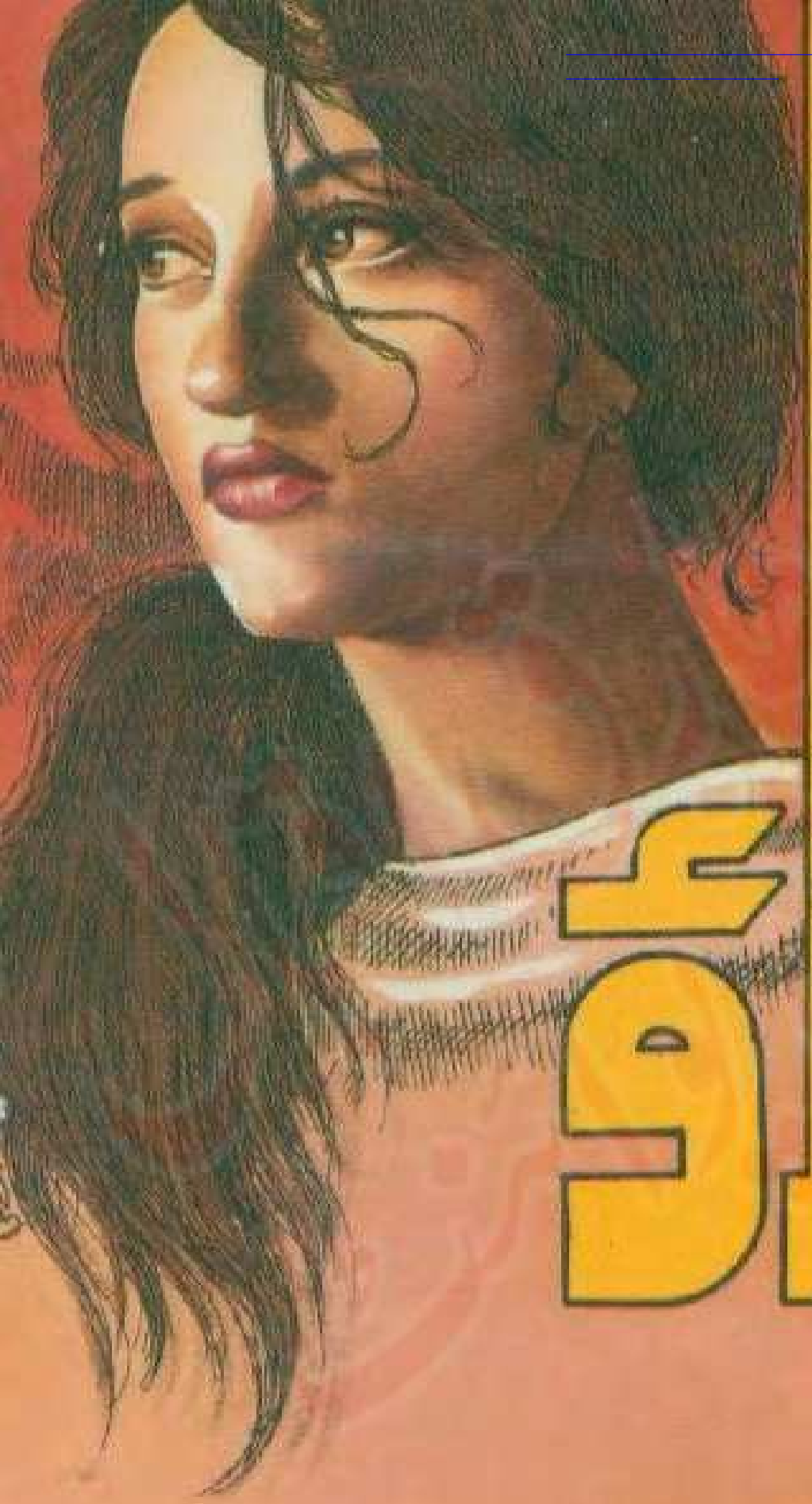

الاؤ

(ناول)

طارق اسمٰعیل ساگر

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بار اوّل ـــــ ۱۹۸۸ء

مطبع :- [illegible]

کوڈ نمبر :-

مجلد :- 969 0 00827 7

ترتیب

۱ — باب اوّل	۷
۲ — باب دوم	۳۴
۳ — باب سوم	۴۶
۴ — باب چہارم	۶۸
۵ — باب پنجم	۸۰
۶ — باب ششم	۹۳
۷ — باب ہفتم	۱۰۳
۸ — باب ہشتم	۱۱۳

انتساب

ا کے نام
اِکو الف تیرے درکار
علموں بس کریں او یار

۱

میرا نام نجمہ ہے..... ! مجھے جان لیجئے۔

آج جب میں اپنے ماضی کے موہنجوداڑو پر بیٹھی اپنی منتشر ذات کی کرچیوں کو مجتمع کر رہی ہوں اور مستقبل میرے سامنے زہریلے ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا ہے تو میرے ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی سوال سر اٹھا رہا ہے کہ میری تخلیق کے بغیر کارخانہ قدرت کے نظام میں آخر کیا کمی رہ جاتی؟

میری ماں مجھے بتایا کرتی تھی کہ میں وقت پیدائش مرتے مرتے بچی اور یہی میرا سب سے بڑا المیہ بن جاتا ہے جیسے بعض لوگوں کا مر جانا۔

مجھے گاؤں کی جیرو ماچھن نے بتایا تھا کہ میرے جنم پر روہانسیاں خون بہا تھا میری ماں کا ڈاکٹروں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں مر چکی ہوں ..... لیکن میں زندہ رہی۔

میں پہلی اولاد تھی لیکن میری ماں اور میرا باپ دونوں میری پیدائش پر خوش نہیں تھے انہیں بیٹے کی امید تھی گاؤں کی دائی سرداراں نے میری ماں سے بھلے وقتوں میں سو روپیہ لے کر اسے درجنوں کڑوی کسیلی دوائیاں کھلائی تھیں اور یہی امید دلائی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہی جنم لے گا۔

نفرت کا زہر میری پیدائش پر میری ماں نے "گرہتی" دیتے ہوئے میری رگوں میں انڈیل دیا تھا۔

میں آپ کو یہی بتانے جا رہی ہوں کہ سانپ ہی اپنے نوزائیدہ بچوں کو نہیں کاٹتا بلکہ انسان بھی اپنے آپ کو ڈس لیتا اور شیطان بن کر اپنی ذات میں زندہ رہتا ہے۔

ایک مرتبہ نوید نے مجھ سے کہا تھا ..... "تمہارا انجام اتنا بھیانک ہو گا کہ اس کے ذکر سے تم پر لرزہ طاری ہو جائے۔ تم مرو گی نہیں۔ زندگی کا جہنم بھگتنے کے لئے تمہاری عمر لمبی ہوتی جائے گی ..... تم چلا چلا کر موت مانگو گی اور موت تم سے منہ موڑ لے گی۔"

جانے کون سی وہ گھڑی تھی جب مجھے نوید نے "شراپ" دے دیا تھا۔ جانے کن کرموں کا پھل بھگت

رہی ہوں میں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے آج سے بہت پہلے مرجانا چاہئے تھا لیکن میں زندہ ہوں۔ اپنے جینے کا واحد مقصد جو میں سمجھ پائی وہ یہی تھا کہ میں آپ کو اپنی کہانی سنا سکوں۔ جی ہاں! مجھ جنم جلی کا جنم ہی شاید یہ فسانۂ الم سنانے کے لئے ہوا تھا۔

میں ایک نیم مذہبی نیم دیہاتی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ پیدائش کے بعد پہلی آواز جو میرے کانوں کے ذریعے میرے لاشعور میں دفن ہوئی وہ میرا منحوس جنم تھا ! میری ماں دائی سرداراں کو کم اور مجھے زیادہ کوستی تھی۔ اسے رہ رہ کر ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ میری وجہ سے اس کے سو روپے ضائع ہو گئے۔ میرے گاؤں کو مضافاتی علاقہ کہہ لیجئے۔ شعور کی آنکھ کھلی تو والد صاحب کو ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کرتے پایا۔ وہ ریل پر دفتر جایا اور آیا کرتے تھے۔ آٹھویں جماعت تک میں نے تعلیم گاؤں کے اسکول ہی میں حاصل کی پھر یکایک ایک روز ہمارے والد نے گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کا اعلان کر کے ساری برادری کو شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ میری دوسری بہن کی پیدائش تھی ۔ اس مرتبہ میری ماں کو دائی سرداراں نے کہہ دیا تھا کہ اس پر میری دادی نے تعویذ کروا دیئے ہیں اور اس گاؤں میں اس کے ہاں کبھی بیٹا جنم نہیں لے سکے گا ... ایسی جہالتیں ہمارے دیہاتوں میں عام ہیں ... ماں نے والد کو مجبور کر دیا تھا ... اور ان کی کیا مجال تھی کہ بیوی کے حکم سے سرتابی کر سکیں۔

"نیاز محمد! عقل کر، کیوں ماں باپ کی جنم بھومی چھوڑ کر شہر جا رہا ہے۔ اللہ رکھے یہاں تجھے کس بات کی کمی ہے۔ گھر بار، ڈھور ڈنگر، کیا نہیں ہے تیرے پاس۔ کیوں ناشکرا ہوتا ہے تو" ... میرے تایا جی نے والد کو سمجھایا۔

"بھائی جی! آپ معاملات میں خود زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔" انہوں نے تایا جی کو ایک ہی جواب میں لاجواب کر دیا۔

"بیٹا! اس دن کو پچھتائے گا۔ باز رہ" ... دادا ابا بولے۔

"جب میں آپ کے پاس مانگنے آؤں گا تو آپ انکار کر دیں مجھے کچھ دینے سے" ... والد نے ان کی سفید داڑھی کی شرم بھی نہ رکھی۔

"کمال ہے اب ہمیں اپنی برائی بھلائی سوچنے کا حق ہی نہیں۔" امی جنہیں اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ان کی تو دیرینہ مراد بر آئی تھی، قریب ہی سے بولیں۔

"بیٹی! ہوش کر۔ کیوں تم لوگ اپنی بربادی پر تلے بیٹھے ہو" دادا ابو نے انہیں سمجھانا چاہا۔ جواب میں امی نے حسب معمول انہیں وہ بے نقط سنائیں کہ بیچارے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ والد صاحب اس دوران میں

کان اور آنکھیں بند کئے وہاں موجود رہے۔

"خدا جانے ان لوگوں کو ہم سے کیوں اتنی دشمنی ہے۔ بھئی میری مرضی، میں چاہے جہنم میں جاؤں۔ اپنا برا بھلا میں نے سوچنا ہے۔ اپنی اولاد کو بھی کیا پینڈو بنا دوں۔" ان کے جاتے ہی والد اونچی اونچی آواز میں بولنے لگے۔

"نیاز محمد! اب سمجھ آئی۔ اب تو تو نے اپنے کانوں سے سن لیا سب کچھ۔ میں نہ کہتی تھی۔ یہاں میرا گزارہ نہیں۔ میرا خدا جانتا ہے جس طرح میرے دن یہاں گزر رہے ہیں۔" امی موقع ہاتھ سے خالی کیوں جانے دیتیں۔ "میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں رہا! سب سمجھتا ہوں۔ آج تک بڑوں کے احترام میں چپ رہا ہوں۔" والد نے گوہر فشانی کی۔

"ماں" ۔ کتنا تقدس ہے اس لفظ میں۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ بعض مائیں ڈائن بن جاتی ہیں۔ زندگی نے مجھے بہت کچھ لکھا پڑھا دیا ہے۔ تجربے سے میں نے بڑا گیان حاصل کیا ہے۔ میں جانتی ہوں عورت تخلیق کرتی ہے۔ یہ خدائی صفت ہے لیکن جب خالق ہی اپنی تخلیق کو ڈس لے۔ اس کی رگوں میں خون کی بجائے زہر بھر دے پھر اسے کیا کہا جائے؟ میں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے دادا ابو، دادی مرحومہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے لڑتے جھگڑتے دیکھا ہے۔ خدا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میرے والد کی آنکھ اس سے لڑی آپس کے تعلقات کا نتیجہ شادی کی شکل میں برآمد ہوا یہ شادی میرے والد نے سارے خاندان کی مخالفت مول لے کر کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اس خاندان سے واقف تھے۔ ایسے "مہذب آبرو باختہ" گھرانے بڑے شہروں میں عموماً پائے جاتے ہیں جو اپنے ماتھے پر شرافت کا لیبل لگا کر اندرون خانہ ہر بے حیائی روا رکھتے ہیں۔ میری ماں کا تعلق بھی ایک ایسے ہی "مہذب" گھرانے سے تھا اور ہماری بدقسمتی کہ ابو سے وہ اچانک ٹکرا گئیں والد ایسے سرکاری محکمے میں ملازم تھے جہاں زیادہ تر عوام سے واسطہ رہتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں امی نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ آدمی کام کا ہے۔ ان کی پہلی ہی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ پھر کبھی والد اس شکنجے سے نہ نکل سکے۔ دیہاتیوں کو عموماً بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ خدا جانے اس میں حقیقت کتنی ہے لیکن میرے والد ضرور بیوقوف تھے کہ والدہ کی خواہشوں کے سامنے سر جھکاتے ہی چلے گئے۔ شادی کے فوراً بعد انہوں نے "رشوت" لینی شروع کر دی تھی۔

یہ نیک مشورہ بھی والدہ ہی نے انہیں دیا تھا جس پر والد صاحب نے آنکھیں بند کر کے عمل شروع کر دیا تھا اور اپنی خاندانی شرافت کو داؤ پر لگا کر جی جان سے اس دھندے سے لو لگا لی۔ جب حرام گھر میں آنے لگا تو حلال کھانے والوں کو ناگوار گزرا۔ انہوں نے والد کو سمجھانا چاہا اور امی کی دشمنی مول لے لی۔ یوں بھی سرداراں دائی میری والدہ کے کان بھرتی رہتی تھی۔ اس کا اپنا کاروبار خطرے میں پڑنے لگا تھا۔ اس نے بیٹا پیدا کرنے کے چکر میں گاؤں کی جانے کتنی عورتوں کو اب تک نہلایا تھا لیکن کسی نے آج تک اس کے خلاف اس طرح بر سر عام

پراپیگنڈہ نہیں کیا تھا۔ میری والدہ شہری عورت تھی وہ چپ کیوں رہتی۔

سرداراں بھی موقع کی تاک میں رہتی دیہاتیوں میں ایک دوسرے کی بات چھپی نہیں رہتی جب سے علم ہوتا کہ والدہ کی گھر میں تو تکرار ہوئی ہے فوراً چلی آتی اور والدہ کے کان بھرنے شروع کر دیتی۔ جو زہر وہ والدہ کے کانوں میں انڈیلتی وہی میرے باپ کے سامنے میری ماں کی زبان پر آجاتا

کہنے والے کہتے کہ میری دادی بیٹے کے غم میں مر گئی وہ بے چاری سیدھی سادی اگلے زمانے کی عورت تھی۔ بیٹے کے کرتوت اس کے علم میں آئے تو پہلے اسے زبان سے سمجھاتی رہیں۔ پھر ناراضی کا اظہار کیا اور جب کسی طرح بھی بھٹکا ہوا بیٹا راہ راست پر نہ آیا تو اپنی شکست تسلیم کر لی اور ایک روز چپ چاپ آنکھیں موند کر جو سوئیں تو پھر کبھی نہ اٹھیں۔

میری پرورش بچپن میں میری دادی نے کی تھی۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا اور امی کی ناراضی مول لے کر میری پرورش پرداخت کرتی رہیں۔ ان کی مہربانی ہی سے میں گھر پر قرآن پاک پڑھ سکی۔ اگر معاملہ امی کے ہاتھ میں ہوتا تو میں بہت دیر بعد جو کچھ بنی وہ بہت پہلے ہی بن چکی ہوتی۔ میری ماں کے لئے یوں بھی میں منحوس تھی۔ وہ میری بہن عابدہ کے جنم کی ذمہ دار بھی مجھ ہی کو قرار دیتی تھی۔ جانے کیا کیا پڑھا دیا تھا اسے سرداراں دائی نے.....!

یہ میری دادی کی ذات تھی کہ جو میری ماں کی پھیلائی برائی اور میرے والد کے درمیان اتنے طویل عرصے تک دیوار بنی رہی۔ ان کی زندگی میں معاملہ والد کے رشوت لینے تک ہی محدود رہا۔ دادی کے مرتے ہی امی کو اپنے برسوں پہلے دیکھے خواب حقیقت بنتے دکھائی دیئے اور ان کی دلی مراد بر آئی۔

ادھر دادی کا جنازہ اٹھا ادھر امی نے اپنے منصوبے پر عمل کیا اس کا آغاز پانچوں وقت نماز پڑھنے سے ہوا۔ دادی کی زندگی میں انہوں نے کبھی دادی کو تعظیم سے بلانا گوارا نہیں کیا۔ ان کی پیٹھ پیچھے جہاں موقعہ ملا ان کی برائی کی، لیکن ان کے فوت ہوتے ہی ان کی تعریفوں کے پل باندھنے لگیں۔ اصل میں یہ سب کچھ اس منصوبے کا حصہ تھا جس پر امی عمل پیرا ہونے جا رہی تھیں۔ میری پیدائش کے دو سال بعد چھوٹی بہن پیدا ہوئی تو والدہ صاحبہ نے ابو کے دل میں یہ بات بٹھانی شروع کی کہ یہاں دیہات میں رہ کر ہم لڑکیوں کو جہنم میں جھونکنے کے علاوہ اور کیا کارنامہ انجام دیں گے۔ اپنے حصے کی جائیداد کے پیسے لو اور شہر میں مکان بنا لو۔ نہ یہاں رہیں گے نہ بچیوں کی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔ جس روز والد نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ وہ گھر جس میں میں نے جنم لیا میرے خون میں رچ بس گیا تھا یہاں سے میں جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب کبھی ایک آدھ دن مجھے شہر جا کر ننھیال میں رہنا پڑتا میں مصیبت میں پھنس جاتی اور اپنی نانی سے بضد ہوتی کہ مجھے واپس گھر پہنچاؤ۔

اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی بات آئی کہ امی یہ سب کچھ صرف ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے کر رہی ہیں کیونکہ ان کے "شہری مزاج" کی وجہ سے کبھی ان کی کسی سے نہ بن سکی۔ دادی کی زندگی کے آخری ایام میں تو یہ نوبت آگئی کہ کوئی امی کے منہ لگنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

ہمارے ہاں ہمارا ایک ماموں اکثر آتا رہتا تھا۔ دادی کی وفات پر جب وہ آیا تو اس کے ساتھ ایک "پیر صاحب" بھی تھے جس کا تعارف اس نے ہمارے گھر والوں سے "اپنے مرشد" کی حیثیت سے کروایا تھا۔ پہلے ہی روز مجھے اس شخص میں چھپی خباثت اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جھانکتی نظر آگئی تھی۔ اس کے بعد ان پیر صاحب کا آنا جانا اکثر ہمارے گھر لگا رہتا۔ والد کو اس نے دو چار کرشمے دکھا کر اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کے تعویذوں کی برکت سے والد ایک دو مرتبہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچے تھے جس کے بعد تو وہ بس پیر صاحب ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ جس روز والد نے امی کے گاؤں بدر ہونے کے فیصلے پر صاد کیا اس روز میں نے ماں کو پیر صاحب کے پاؤں چھوتے دیکھا۔

"حضرت جی! آپ کے تعویذوں کی برکت سے آج سے میرا سویا مقدر جاگا ہے۔"

انہوں نے بڑی عقیدت سے دودھ کا گلاس پیر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ میں نجانے کیوں وہاں چھپ کر کھڑی تھی۔ اس لمحے میرے لاشعور میں کیا تھا یہ میں آج تک سمجھ نہیں پائی۔ شاید کوئی وسوسہ کوئی وہم خوف یا پھر وہ شک جس کی تصدیق کرنے کے لئے میں نے یہ غیر اخلاقی حرکت کی تھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔

اس روز مجھے علم ہوا کہ میری والدہ اس بدمعاش پیر سے الٹے سیدھے تعویذ لے کر ابو کو چلاتی رہی ہے۔ یہ میرے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کیوں کہ ایسے واقعات ہمارے دیہاتوں میں آئے روز سننے دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ اور ایسے جعلی پیروں کے لئے ہمارے دیہات بہترین شکار گاہ ثابت ہوتے ہیں ہم بھی خاصے ضعیف عقیدہ لوگ تھے اور پیر پرستی کے کچھ زیادہ قائل یہی وجہ ہے کہ کسی نے اس پیر پر شک نہ کیا، بلکہ اس کی خدمت ہی میں جتے رہے۔

اپنی ماں سے نفرت کا آغاز میں نے شاید اس روز شعوری طور پر کر دیا تھا۔ شاید اس وقت میں کھل کر اس بات کا اظہار نہ کر پاتی۔ ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی جس کی پرورش دیہاتی اور مذہبی قسم کے ماحول میں ہوئی ہو کبھی ایسی گھٹیا سوچ کا تصور بھی نہیں کر سکتی لیکن اس روز کسی نادیدہ ہستی نے چپکے سے میرے کانوں میں کہا کہ یہ ماں نہیں ... صرف عورت ہے ... عورت۔!

اور جب عورت اپنے تقدس مآب رشتوں سے ناطہ توڑ کر صرف عورت ہی رہے تو وہ "خطرناک عورت" بن جاتی ہے ... جی ہاں! ایسی عورت جس پر دنیا کے تمام مذاہب شک کرتے ہیں جو باعث فساد کہلاتی ہے۔ ایسی ہی عورت گالی بن کر سماج کے ماتھے کا کلنک بن جایا کرتی ہے تاریخ میں جا بجا یہ عورتیں آپ کو پڑھنے

ملیں گی جنہوں نے خدا کی زمین پر فساد کے بیج بوئے اور ان کی فصل کاٹنے والوں کو اپنے سروں کی کٹوانی پڑی۔

جب والد صاحب کسی طرح اپنا فیصلہ بدلنے پر رضامند نہ ہوئے اور بضد رہے کہ انہیں ان کے حصے کی جائیداد بیچنے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ ہماری موروثی جائیداد تھی تو میرے دادا نے ان کے حصے کی زمین کی قیمت اس وقت آٹھ ہزار روپے انہیں ادا کر دی ..... لیکن ساتھ ہی کہہ دیا تھا

"نیاز محمد! آج سے تم ہمارے لئے مر گئے۔"

میرے دادا اپنے قول کے پکے تھے۔ مرتے دم تک والد کو منہ نہ لگایا اور مرتے وقت وصیت کر دی کہ نیاز محمد میرے جنازے کو ہاتھ نہ لگائے۔ دادی بے چاری کی طرح چپ چاپ آنکھیں انہوں نے بند نہیں کیں بلکہ ہمیشہ کے لئے والد کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال گئے۔ ان کا فیصلہ غلط تھا یا صحیح؟ اس کا فیصلہ تو میں نہیں کر پائی لیکن ان کے صدق کو سلام کہ اپنے قول سے نہ پھرے۔

ماموں نے شہر میں مکان ہمارے لئے پہلے ہی تاڑ رکھا تھا۔ یہ ہمارے ننھیال کے محلے ہی کا ایک خالی مکان تھا جو امی کے لئے ان لوگوں نے کرائے پر حاصل کر لیا۔ جس روز میں دادا سے جدا ہوئی میرا کلیجہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں سسکیاں لے کر رو رہی تھی اور امی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ روتی بلکتی کو کھینچ کر دادا سے الگ کیا اور ابو کے دفتر کی اس ویگن میں دھکیل دیا جو ہمیں لے جانے آئی تھی۔ اپنے پیاروں سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد حالات نے پھر کبھی مجھے ان سے ملنے نہ دیا۔

امی نے آٹھ ہزار روپیہ جو اس زمانے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا مکان کی زیبائش کی نذر کر دیا اور بلاشبہ ہمارا گھر سجاوٹ کے لحاظ سے اس محلے کے چیدہ چیدہ مکانوں میں شامل ہو چکا تھا۔ شہر کی زندگی کے اپنے تقاضے ہیں۔ آدمی آگے ہی آگے بڑھنا چاہتا ہے اور وہ لوگ جو یہ منصوبہ لے کر شہر آئے ہوں وہ بھلا کب پیچھے رہتے۔ والدہ صاحبہ کی نمازیں کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہو گئیں۔ سفید سے کالا برقعہ پھر سفید چادر۔

آنکھوں پر انہوں نے سنہری فریم کا خوب صورت سا چشمہ سجا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کایا ایسی پلٹی کہ وہ ہماری ماں کے بجائے بہن دکھائی دینے لگیں۔ اس دوران ہمارے اطوار بھی بدلنے لگے۔

اپنے ننھیال کا تعارف میں نے آپ سے کروا ہی دیا ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی روشن خیال لوگ تھے۔ آہستہ آہستہ ہم بھی ان کے رنگ میں رنگنے لگے۔ مجھ پر دادی کی چھاپ کچھ ایسی گہری تھی کہ کوئی اور رنگ نہ چڑھتا تھا۔ چھوٹی بہن کی بات البتہ اور تھی۔ والدہ نے میرے تجربے سے نصیحت حاصل کی اور اسے شروع ہی سے ننھیال میں اس طرح گھلا ملا کر رکھا تھا کہ ددھیال سے اسے اتنی نفرت ہو گئی جتنی مجھے اپنے ننھیال سے۔

میرے ننھیال کی لڑکیاں سینماؤں میں فلمیں دیکھتیں گھومنے جاتیں ..... سیر سپاٹے ہوتے۔ آئے دن پکنک کے پروگرام بنتے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں دعوتیں اڑتیں۔ لیکن اول تو میں ان پروگراموں میں شرکت

نہ کرتی اگر بادل ناخواستہ کرنی ہی پڑتی تو بڑی بددلی سے ان کا ساتھ دیتی۔ چھوٹی بہن کی بات البتہ الگ تھی۔ وہ سال پر لگا کر اڑے۔ پہلے پہل تو گاؤں بہت یاد آیا لیکن آہستہ آہستہ صبر آ گیا۔ گاؤں سے اول تو کوئی ہمیں ملنے ہی نہ آتا۔ اگر کسی نے یہ جرأت کر بھی لی تو امی ابو کی غیر موجودگی میں اسے اس طرح ذلیل کیا کہ دوبارہ کسی کو وہاں گھسنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک بیچارہ سا ایسے تھے جو صرف میری خاطر مہینے میں ایک آدھ چکر ہمارے ہاں لگایا کرتے۔

میں اب میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ مجھے پڑھنے کا جنون سا تھا۔ ایک خواب دیکھا تھا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننے کا۔ اسی دھن میں پڑھنے میں مگن رہتی۔ پہلے پہل تو سکھیاں کھینچ لے جایا کرتی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں کسی طرح ان کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی تو انہوں نے میرے مختلف نام چڑانے کے لئے رکھ دیئے۔ جب یہ حربہ بھی ناکام رہا تو مجھ سے بے رخی اختیار کرنے لگیں۔

یہ میرے لئے غنیمت تھا..... !

○

میں نے ان دنوں دسویں کا امتحان دے رکھا تھا اور بیکار گھر پڑی تھی لڑکیوں کے لئے مخصوص رسائل زیر مطالعہ رہتے اور اب تو یہ نوبت آ رہی تھی کہ میں خود کو ان میں لکھی کہانیوں کا ایک کردار محسوس کرنے لگی تھی۔ کم عمری ہی میں میرا ذہن پختہ ہو چلا تھا۔ میری عمر اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن میری سوچ کا انداز نوجوان اور پکے ذہن کی لڑکیوں کا سا تھا۔ کہانیاں پڑھ پڑھ کر میں بھی خواہش کرنے لگی تھی کہ کوئی شہزادہ آئے اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ان ابتلا و کرب کی گھڑیوں سے نجات دلا دے۔ تصور ہی تصور میں میں نے ایک بت تراش لیا تھا۔ پھر دل ہی دل میں اس کی پوجا بھی شروع کر دی۔ خواب حقیقت کیسے بنتے ہیں اس کا علم مجھے اس روز ہوا جب میرے سپنوں کا شہزادہ ایک روز اچانک حقیقت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

مکانوں کی دیواریں اس طرح بغل گیر ہوتی ہیں کہ سارے مکان ایک ہی مکان دکھائی دیتا ہے۔ پانچ فٹ کی گلی جو صرف تکلف خالی چھوڑی ہوتی ہے' کے دو رویہ مکانوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ اگر ایک مکان کی کوئی کھڑکی کھلی رہ جائے تو سامنے کے چار پانچ مکان کے مکینوں کو دعوت نظارہ مل جاتی ہے۔ مکانوں کے چھجے اس طرح آگے کی سمت جھکے ہوتے ہیں کہ گلیوں میں دھوپ کا داخلہ ممنوع قرار پاتا ہے۔

ہمارے سامنے والے گھر کی دوسری منزل میں چند روز پہلے نئے کرایہ دار آئے تھے۔ میں بھی اپنے کمرے میں جس کی کھڑکی اس گھر کے عین سامنے کھلتی تھی' محو مطالعہ تھی۔ پچھلے دو تین روز سے اس مکان کی وہ کھڑکی جو میرے سامنے کھلتی تھی بند تھی۔ اس روز جو میں آہٹ پر اس سمت چونکی تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

اس روز رسالوں میں پڑھی ساری کہانیاں سچ ہو گئیں وہ آصف تھا..... میرا خواب خواب زندہ بھی ہو

ساتے ہیں۔ کبھی گمان نہیں گذرا تھا

یہ دل کی نگری کا بھی کتنا عجیب۔ کتنا نرالا دستور ہے۔ اس شہر کی بادشاہت اسی مسافر کا مقدر ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس نگری پر دستک دے۔ اس رات تو جیسے بند کھڑکیوں کے بٹ کھول کر آصف نے مجھ پر محبت کا ہم اعظم پھونک دیا۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ناریل کا سخت چھلکا توڑ کر اس میں سفید پھول کا دل رکھ کر اس کے ریشوں اور بنکھیڑ ہوں میں خوشبو کا خون دوڑا کر وہ پھول میرے حضور پیش کر دیا ہو۔ میری حالت پہاڑ کی دو درزوں کے درمیان صدیوں سے چاند کی کرن کے انتظار میں رکھے اس پتھر کی سی تھی جسے اس کرن نے موتی میں بدلنا تھا۔ چاند طلوع ہو چکا تھا۔ کرنوں نے ایک مخصوص زاویے سے پتھر پر نچھاور ہو کر اسے موتی بنا دیا تھا.....!

ہمالہ کی منگلاخ چٹان سے ٹیک لگا کر جدائی کے گیت گاتی دیوداسی کا پردیسی لوٹ آیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پڑے رسالے کی کہانیوں کے تمام ہیروز نے آصف کا روپ دھار لیا اور تمام ہیروئنز نجمہ بن گئیں۔

یہی تو تھا وہ جس نے ظلم کی چکی میں پستی یتیم ہیروئن کو بھری برادری میں اپنا بنانے کا اعلان کیا تھا۔

اسی نے بدقسمت اور معاشرے کی ستائی ہوئی لڑکی کو بڑھ کر گلے لگایا تھا۔

وہ جس نے غریب پھول چننے والی پھاڑن کے گیتوں کو زندگی بخشی تھی یہی تو تھا.....!!

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی.....!

پھر حجاب آڑے آیا اور میری نظریں خود بخود جھک کر میرے دامن سے الجھنے لگیں جہاں دل کی بے قابو دھڑکنوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔

دوبارہ جب میں نے کن اکھیوں سے اس سمت دیکھا تو وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے ہی اصل میں اس لمحے ایک دوسرے کا چور پکڑ لیا تھا۔

امی اور چھوٹی بہن عابدہ دونوں کسی کے ہاں "ختم" پر گئی ہوئی تھیں۔ ایسے "ختم" اور "مولود شریف" اکثر ہمارے گھر میں برپا رہتے تھے۔ مجھے علم تھا کہ شام سے پہلے ان کی واپسی ممکن نہیں، لیکن پھر بھی میرے اندر کا چور مطمئن نہیں تھا۔ اسی چور کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں کن اکھیوں سے اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھتی اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی تاکہ امی اور عابدہ کی غیر موجودگی کا اطمینان کر آؤں۔

جاتے وقت جس سونڈھے پر میں بیٹھی تھی ہاتھ میں پکڑا رسالہ کھول کر رکھ آئی جو اس کتاب کا اشارہ تھا کہ میں لوٹ کر آؤں گی.....!

کتنی معصوم ہوتی ہیں ابتدائی محبتیں.....!! جانے کون سیدھی سادھی لڑکیوں کو دنیا والوں کی نظروں سے بچنے کے بہانے اور جذبات کا اظہار کرنے کی گونگی زبان سے آشنائی بہم پہنچا دیتا ہے۔ شاید محبت اپنی حفاظت کا

ڈھنگ بھی جانتی ہے! جب یہ جذبہ کسی معصوم دل پر گرفت کرتا ہے تو حاسد طاقتوں سے محفوظ رہنے کے گر بھی اسے ساتھ ہی سکھا دیتا ہے۔ شاید!

نچلی منزل کے باہری دروازے تک جا کر میں پلٹ آئی اور دوبارہ اسی سونڈھے پر بیٹھ گئی۔ آصف بھی حیلے بہانوں سے وہیں موجود تھا..... ہم دونوں جانے کب تک وہاں بیٹھے ایک دوسرے کو بے قابو دھڑکنوں اور چور آنکھوں سے دیکھا کیے تب اچانک وہ کسی کے بلانے پر نیچے چلا گیا۔

جانے سے پہلے اس نے بڑی عجیب سی حرکت کی۔ اس نے جاتے جاتے اچانک مڑ کر اپنے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر مجھے سلام کیا اور بھاگ گیا میرے وجود کے سارے تاریک دم جھنجھنا اٹھے، سخت سردیوں میں بھی پسینے سے میری ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

ایک بے نام سا نشہ مجھے مدہوش کرنے لگا۔ نجانے کتنی دیر تک میں کھڑکی لگائے اس کی منتظر رہی لیکن مسافر نہ پلٹا تو عجیب سوگوار سی کیفیت لے کر اٹھی اور دوسرے کمرے میں بچھے بستر پر گر کر اپنی بے قابو دھڑکنوں کا شمار کرنے لگی۔

اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ رسالوں میں لکھی جانے والی محبت کی ساری کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔ ہر ہیروئن کا نام نجمہ اور ہر ہیرو کا نام آصف ہے.....! شام کو جب والدہ اور عابدہ واپس پلٹیں تو میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

"کیا دیکھا لیا ہے؟" عابدہ نے بڑے طنز سے کہا۔

"کچھ نہیں"۔ میں اس کے سوال پر کچھ گڑبڑا سی گئی۔

"کمال ہے۔ تمہارے چہرے پر مسکراہٹ ہونٹوں پر ہنسی.....؟"

"ہنسنا اور مسکرانا کیا ممنوع ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"ممنوع تو نہیں لیکن تم نے تو گناہ سمجھ رکھا ہے"۔ وہ بولی۔

"ہر وقت دانت نکالنا مجھے اچھا نہیں لگتا عابدہ!" میں نے سنجیدگی اختیار کرنی چاہی کہ کہیں وہ میرے دل کا چور پکڑ نہ لے۔

"ویسے ہے ضرور کوئی بات....." عابدہ شرارت سے مسکرائی اور میں سہم کر رہ گئی۔

خدایا! ابھی تو آغاز نہیں ہوا۔ تمہید ہی بندھی ہے۔ ابھی سے اگر یہ رازِ حشت ازبام ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے میری ہر بات پر خواہ مخواہ شک کرنے لگتی ہو"۔

میں نے اپنی دانست میں اسے ڈانٹا ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مجھے اپنی آواز کھوکھلی اور لہجہ مصنوعی سا

لگ رہا تھا"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے..... " عابدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا مطلب ہے؟"

"چلو ہمیں پتہ تو چل ہی جائے گا" ۔ اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بیوقوف مجھے تو ایک کہانی پڑھ کر بار بار ہنسی آ رہی ہے" ..... جانے کیسے مجھے یہ جھوٹ سوجھ گیا اور عابدہ نے یقین کر لیا۔ اسے میرے مطالعے کی عادت کا علم تھا۔

"زیادہ نہ ہنسنا شروع کر دینا۔ کہیں تمہیں پاگل خانے بھیجنا پڑے" ۔ اس نے طنزیہ لقمہ دیا اور وہاں سے چلی گئی۔

رات جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو دن کے واقعات نے جو ذہن سے چپک رہے تھے خود کو دہرانا شروع کر دیا۔ سخت سردی کی وجہ سے کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے لوگوں نے حسب توفیق کمروں میں ہیٹر جلا رکھے یا کوئلے کی انگیٹھیاں دہکا رکھی تھیں۔

اس ٹھنڈک کے عالم میں بھی مجھے اپنی آنکھیں اور ماتھا سلگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ جسم میں ہلکا ہلکا درد ہلکورے لینے لگا۔ پلکیں بوجھل ہو چلی تھیں۔ رات دیر گئے تک میں کروٹیں بدلتی رہی۔ خیالات کے گرداب سے نکلنے کے لئے جب کسی رسالے کو ہاتھ لگایا۔ الفاظ دھندلا جاتے اور ان میں سے ایک شبیہ ابھر کر سامنے آ جاتی۔ آصف کی امی اور ابو نچلے کمرے میں اور عابدہ دوسرے کمرے میں سوتی تھی۔ یہ چھوٹا سا کمرہ میرے تصرف میں رہتا تھا۔ میں نے لائٹ آف کر دی کہ اسی بہانے نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو جائے لیکن نیند کہاں؟

اب تو میرے لحاف میں رکھے پاؤں بھی جلنے لگے تھے میں نے پاؤں لحاف سے باہر نکال لئے پھر بھی گھبراہٹ ختم ہوئی تو لحاف اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ تپش سے میرے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تھے میں نے اٹھ کر پانی کا گلاس پیا اور ننگے پاؤں فرش پر ٹکا کر چارپائی پر بیٹھ رہی کہ اس طرح کچھ سکون نصیب ہو جائے۔ جب کسی طرح نیند کی دیوی نہ مانی تو میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ باہر گلی کے ایک کونے میں لگے پول سے بھالسی پر لٹکے بلب کی زرد روشنی گلی میں ٹکریں مار رہی تھی میری نظریں بے اختیار سامنے گئیں۔ کھڑکی بند تھی۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں لگی سلاخوں سے چہرہ ٹکائے باہر جھانکنے لگی۔ لوہے کی ٹھنڈی سلاخوں سے چہرہ لگا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جلتی آگ پر پانی پھینک دیا ہو۔ مجھے خاصا سکون محسوس ہونے لگا۔ جی چاہتا تھا اسی طرح سلاخوں سے چہرے کو لگائے بیٹھی رہوں جب اچانک ہی مجھے وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔

جی ہاں..... بات ہی کچھ ایسی تھی۔ سامنے والے پٹ وا ہوئے اور ان کے پیچھے سے آصف کا چہرہ برآمد

ہوا۔ گلی میں پھیلی پیلے رنگ کی مردہ روشنی اس کے کمرے میں گھس گئی۔ میری آنکھوں کی پتلیوں نے جنبش کرنا بند کر دیا اور میں پتھرائی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اف میرے خدایا آصف بھی اسی آگ میں پھنک رہا ہے جس کا ایندھن میں بنی ہوئی ہوں۔ میں نے سوچا۔

میرے پاؤں اچانک سُن کر ہو کر اپنی جگہ جم گئے تھے۔ چند منٹ پہلے تک جھلستا ہوا وجود مجھے اب برف میں پھنسا نظر آ رہا تھا۔ کسی نے میرے پاؤں برف میں گاڑ دیئے تھے اور پاؤں میں سلگتے انگارے اب ماتھے میں اکٹھے ہونے لگے تھے۔ میں نے چاہا ہی تھا کہ یہاں سے ہٹ جاؤں لیکن زمین نے جیسے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ مجھے گاؤں میں تماشہ دکھانے والے وہ مداری یاد آ گئے جو اپنے معمول کے پاؤں باندھ دیا کرتے تھے۔

آصف یقیناً اسی کیفیت کا شکار تھا۔ وہ بھی پہلے میری طرح حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تڑپی اور اس نے صبح والی حرکت دہرا دی۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کا دایاں ہاتھ کسی مقناطیسی عمل کے تابع ہو کر اٹھا اور اس کے ماتھے سے جا لگا مجھ پر صبح کی طرح پھر گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ بے چین ہو کر میں نے کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی کی چٹخنی چڑھا کر میں اس سے پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اس طرح ہانپنے لگی جیسے سینکڑوں میل کی مسافت پیادہ پا طے کر کے آ رہی ہوں!

کھڑکی کے ساتھ پیٹھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بھی مجھے یہی احساس ہو رہا تھا جیسے اسکی خوبصورت اور سرخ ہوئی آنکھوں میں سے برقی لہریں نکل کر میرے جسم کو چھیدنے لگی ہیں۔

کھڑکی سے چارپائی تک کا پل صراط میں نے ڈگمگاتے قدموں سے پایا پھر بے سدھ ہو کر بستر پر جا گری۔ جانے کب مجھے ان بے رحم لمحات سے امان ملی اور میں نیند کی آغوش میں سما گئی۔ جہاں آصف کا ماتھے تک اٹھا ہاتھ کشکول بن کر میری آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگا۔ وہ مجھ ناکس سے کس شے کی بھیک مانگ رہا تھا؟ میرے پاس اسے دینے کے لئے تھا ہی کیا؟ !!! میں تو خود منتشر ہو رہی تھی۔ مجھے خود اپنے آپ کی خبر نہیں تھی۔

ساری رات میں نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ وہ بے نام سی عجیب عجیب خواہش جو نجانے کب سے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھیں، شکلیں بن کر میرے سامنے ناچنے لگیں۔

یہ کیسا رقص تھا۔

کیسا دردناک سرور تھا یہ! خدائی پناہ!

صبح اٹھی تو جسم ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ رات بھر کی "جاگو بیٹی" سے میرا بند بند دکھ رہا تھا۔ آج میرا میٹرک کا نتیجہ نکلنا تھا۔ اسوا تو مجھے نماز پڑھ کر رزلٹ کا پتہ کرنے اسکول جانا چاہئے تھا لیکن آنکھ دیر سے کھلی، سورج نکل آیا تھا۔ نجانے امی نے بھی آج کیوں مجھے نہ جگایا حالانکہ صبح میرے کبھی بھی دیر سے اٹھنے پر وہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کرتی تھیں۔

ناشتہ ہم نے شہر کی روایت کے مطابق بازار سے منگوایا اور تھوڑی دیر بعد میں کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے میں گئی تو دل بے اختیار کھڑکی کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ الٹی سیدھی مانگ نکالی اور کھڑکی کھول دی۔

آصف کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے لیکن سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے دکھ ہوا۔ دو تین منٹ میں نے مختلف بہانوں سے کھڑکی کے سامنے گزار دیئے۔ جب مراد بر آتی نظر نہ آئی تو سکول جانے کے لئے چل دی۔ سیڑھیوں میں پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ پرس کمرے میں رہ گیا ہے۔ اس مرتبہ جب پرس اٹھانے گئی تو دل دھک سے رہ گیا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے لگا آصف میرے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ رات کی طرح زمین نے ایک مرتبہ پھر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ مجھے کچھ اور تو نہ سوجھا۔ دیوار کی طرف منہ کر کے دوپٹے کا پلو مروڑنے لگی لیکن کن اکھیوں سے میں اس کو دیکھتی رہی۔

آصف کو شاید علم تھا کہ میں نہانے سے دوسری سمت منہ کیا ہوا ہے۔ میری نظریں اسی پر لگی ہیں۔ اس نے وہی حرکت دہرائی اور ہاتھ اٹھاتے تک لے گیا۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں اس کی آنکھوں کی حرکت بھی نوٹ کر رہی تھی۔

اس لمحے میرا جی بے اختیار اس شخص کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنے لگا جس نے اظہار محبت کے لئے سلام کرنے کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو گا' شاید اپنے کسی لاشعوری فعل کے تحت میرا ہاتھ بھی بے اختیار سر کے بالوں سے چھو گیا۔ یہ سب کچھ ایک بے خودی کی سی حالت میں مجھ سے سرزد ہوا۔ جب مجھے اپنی اس معصوم غلطی کا احساس ہوا تو گھبراہٹ اور شرم کے مارے میں بے حال ہونے لگی۔ سینے کے پنجرے میں دل کا پنچھی بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

میں بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹی۔ مڑتے ہوئے میں نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔ ہماری آنکھیں پوری آگہی کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ خوشی سے ہم دونوں کے چہرے گلنار ہو رہے تھے۔ کمرے سے میں قریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی۔ میری حالت اس چور کی سی تھی جسے ہر لمحے پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

"جلدی واپس آنا۔ ہم نے شاہ صاحب کے گھر مولود شریف پر جانا ہے"۔ امی نے رسوئی سے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

"اچھا امی!" بمشکل میں نے کہا۔

گھر کے دروازے سے میری نظر اسی سمت اٹھی تھی۔ آصف اپنے کالج کا بلیزر (کوٹ) پہنے ہاتھ میں

فائل اٹھائے شاید میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہمارے شہر کے سب سے بہترین کالج کا کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کی تعلیمی قابلیت کا غماز تھا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یقیناً یہ سب کچھ میں نے اپنے آئیڈیل سے متعلق سوچ رکھا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ قدرت نے اسے میرے ہی لئے یہاں بھیجا ہے۔

ہمارے محلے کے لوگوں کے ذہن بھی گلیوں کی طرح تنگ اور گندگی بھرے تھے۔ مجھے علم تھا میری یا اس کی کسی بھی غیر معمولی حرکت پر اگر کسی کو شک ہو گیا تو قیامت آ جائے گی ...!

یہاں کے لوگوں کا مشغلہ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اور ان کے متعلق سوچ سوچ کر خواہ مخواہ اپنے ذہن سے اپنی مرضی کا نظریہ گھڑ لینا تھا۔ میں نے اس کے اسمارٹ سراپے پر بھرپور نظر ضرور ڈالی تھی لیکن یہ بات میرے پیش نظر تھی کہ یہاں کئی میلی نظریں مجھے کھا جانے کی حد تک گھور رہی ہیں اور مجھے ان سے خود کو ہی نہیں آصف کو بھی بچا کر رکھنا ہے۔

آصف کو بھی شاید تھوڑے ہی دنوں میں یہاں کے قوانین اور طور طریقوں کی سمجھ آ گئی تھی۔ وہ مجھ سے بظاہر بالکل لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور مضبوط قدموں سے باہر جانے والے راستے پر گھوم گئی۔ اس بات کا احساس میرے لئے بڑا لذت آمیز تھا کہ آصف میرے تعاقب میں آئے گا۔

گلی کا موڑ مڑتے ہوئے میرے اندازے کے عین مطابق میں نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھا۔ اگر مجھے اس سے خصوصی نسبت حاصل نہ ہو گئی ہوتی تو اس کے محتاط رویئے کے پیش نظر میں بھی کبھی اس پر اپنے تعاقب میں آنے کا شک نہ کرتی۔

بس سٹاپ تک وہ اسی طرح میرے پیچھے پیچھے آیا اور اسی بس میں سوار ہو گیا جس میں بیٹھ کر مجھے سکول جانا تھا۔ میرے سکول اور اس بس سٹاپ کے درمیان جہاں میں اترا کرتی تھی قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ آصف میرے پیچھے ہی بس سے اترا اور آہستہ آہستہ چلتا میرے نزدیک آ گیا۔ اس راستے پر لوگوں کی آمد و رفت کم ہی رہتی تھی۔

اس کو قریب آتا محسوس کر کے یقین مانئے مجھے اپنی جان ہی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ خود اس نے بھی اتنی جرأت کا مظاہرہ کیسے کیا یہ میں بھی نہ جان پائی!

اب سوچتی ہوں کہ یہ عشق کا جذبہ کم بخت ہوتی ہی عجیب شے ہے۔ بزدل کو بہادر اور بہادر کو بزدل بنا دیتا ہے۔ آصف عام نوجوانوں سے بالکل مختلف سیدھا سادا' محنتی اور فرمانبردار نوجوان تھا۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور ماں باپ کے مستقبل کی امید! ایسا نوجوان جس نے بہت تھوڑی عمر ہی میں اپنی ذمہ داری کا احساس کر لیا تھا۔ خدا جانے اسے مجھ میں کیا نظر آیا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

"آپ کا نام نجمہ ہے"۔ اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

مجھے صرف ایک بات کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کسی نے گزرتے ہوئے اسے یہ حرکت کرتے دیکھ نہ لیا ہو لیکن ہائے ری محبت ... انسان کو کیا کیا ڈھنگ سکھا دیتی ہے تو آصف نے اتنی چالاکی سے اپنی بات مجھ تک پہنچائی کہ خود مجھے بھی محسوس نہ ہو سکا کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ یہ بات کہہ کر اس نے مجھے ایک دو قدم آگے نکل جانے کا موقع دیا۔

اس کی ایک بہن عابدہ کی سہیلی بننے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ ممکن ہے اس کے ذریعے میرا نام اس تک پہنچ گیا ہو۔ دل نے کہا پگلی کیوں ڈرتی ہے۔ کہہ دے نا!

"آپ کا نام ...؟" میں نے بے قابو دھڑکنوں کو زبان دی۔

"آصف ... آپ نے میری بات کا برا تو نہیں منایا ..." اس نے جواب سوال اکٹھا ہی کر دیا۔

میں خاموش رہی۔ زبان گنگ ہو رہی تھی۔ دل تو چاہتا تھا فوراً کہہ دوں "نہیں شہزادے! مجھے تو جانے کب سے تمہارا انتظار تھا۔ میری تپسیا مکمل ہو گئی ہے۔ میرا من باس پورا ہو گیا ہے" ... لیکن کچھ نہ کہہ پائی۔

آصف میرے نزدیک آ چکا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں صرف مسکرا دی اور ہونٹوں پر "نہیں" لرز کر رہ گیا۔ سامنے سے لڑکیوں کی ایک ٹولی آ رہی تھی۔

"شکریہ" کہہ کر وہ اپنا دمکتا چہرہ لے کر پرے ہٹ گیا۔ میرا اسکول نزدیک آ گیا تھا۔ آصف پہلو بدل کر دوسری سمت مڑ گیا۔

بے ترتیب سانسوں، بے قابو دھڑکنوں، سینہ بسینہ وجود کے ساتھ جب ہونٹوں کی لرزش سنبھالتی اسکول پہنچی تو علم ہوا کہ میں اسکول میں دوسرے نمبر پر آئی ہوں۔ اس شادی مرگ کی کیفیت سے طاری نہیں ہوئی مجھ پر ورنہ اس میں کسر تو کیا رہ گئی تھی۔

سہیلیاں مجھے مبارکباد دے رہی تھیں۔

علیحدگی کے رونے رو رہے تھے۔

مستقبل میں ملنے کے منصوبے۔

نئے کالج میں داخلے کی باتیں۔

ایک دوسری کے گھروں کے ایڈریس، لیکن میں ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

بظاہر تو میں ان کے درمیان کھڑی ان کی مبارکباد وصول کر رہی تھی لیکن اصلاً میری روح کہیں اور پرواز کر رہی تھی۔ میں تصور میں پرواز کرتی کھڑکی کی سلاخیں تھامے اپنے سامنے کھڑے آصف کو اپنی کامیابی کا مژدہ سنا کر اس کی مبارکباد وصول کر رہی تھی۔

وہ بڑے نصیبوں والا دن تھا۔ کئی خوشیاں ایک ساتھ ملی تھیں مجھے۔ سارے خواب حقیقت بنتے جا رہے تھے۔ میرا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہونا دکھائی دے رہا تھا ... ! ان دنوں خود کو کتنا خوش بخت جاننے لگی تھی میں۔

آج سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ اصل میں تقدیر نے میرے ساتھ بھیانک مذاق کا آغاز اسی روز کر دیا تھا جب کہ میرا "چنتو" دم پیدائش ہی ہو چکا تھا۔

فلسفہ تقدیر کبھی میرے ذہن میں نہیں سما پایا۔ میں آپ کو بھی اس کی موشگافیاں سمجھانے نہیں جا رہی لیکن مجھے یہ ضرور کہنے دیجئے کہ اس لمحہ اگر کوئی میرا بازو پکڑ کر مجھے سراہوں کے اندھے جزائر سے حقیقت کی راہ پر ڈال دیتا تو یہ روز بد شاید میرا مقدر نہ بنتا ... !

بھاگم بھاگ گھر پہنچی جہاں ماں اور چھوٹی بہن بنی ٹھنی باہر جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ عابدہ دوسرے سکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا رزلٹ ابھی نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آصف کی بہن کو اپنی البم دکھا رہی تھی جو اس کے عجیب و غریب پوز بنا بنا کر کھنچوائی گئی تصاویر سے بھری پڑی تھی۔

"امی میں سارے سکول میں سیکنڈ آئی ہوں۔ میں نے سکالرشپ حاصل کیا ہے"۔ میں خوشی سے چلاتے ہوئے امی سے لپٹ گئی۔

"اری ہٹ پرے کیوں میرے کپڑوں کا ستیاناس کر رہی ہے۔ سارا سارا دن سوئے پڑھنے کے اور تجھے کام ہی کیا ہے کرنے کو ... سارا سکول چھوڑ تجھے تو سارے ملک میں اول آنا چاہئے تھا۔ گھر بار کی فکر تو نجانے تجھے کب ہو گی۔ کمبخت تجھ سے زیادہ عقل مند یہ چھوٹی ہے۔ جہاں جاتی ہے لوگ تعریفیں کرتے ہیں۔ ایک تو ہے کہ گھر میں منہ دیئے پڑی رہتی ہے۔ پڑھاکو کہیں کی"۔

امی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

امی کے اس رویئے سے دل بجھ سا گیا لیکن پھر جلد ہی نارمل ہو گئی کیونکہ مجھے ان کی عادت کا علم تھا۔ وہ مجھ سے زبردست ذہنی اختلاف رکھتی تھیں۔ دادی اماں نے میرے اور ان کے درمیان سوچوں کے متضاد انداز کی جو خلیج حائل کر دی تھی اسے پاٹنا میرے لئے مشکل تھا جب کہ امی کے لئے ناممکن تھا!۔ وہ مجھے اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بن سنور کر ان کے ساتھ سیر سپاٹے کیا کروں تاکہ میرے حسین سراپے کی نمائش کر کے جہاں وہ اپنی کسی مخصوص حس کو تسکین پہنچا سکیں وہاں ان کی خود ساختہ سوسائٹی میں ان کا وقار مزید بڑھ جائے کہ سوصورت ایک عدد خوبصورت بیٹی کی ماں بھی ہیں۔

"آپ کو مبارک ہو باجی!" آصف کی بہن فرزانہ نے مجھے مخاطب کیا۔

"شکریہ"۔ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

امی کے نامناسب رویہ نے فرزانہ کو بھی سوگوار سا کر دیا تھا۔ لڑکی رحم دل معلوم ہوتی تھی۔

"امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اگر باجی کو گھومنا پسند نہیں تو اس میں زبردستی ہے کیا؟ عابدہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے قریب کھینچ لیا اور میری دلجوئی کو امی سے کہہ دیا۔

"اے لو! بیٹی کون سی قیامت آ گئی۔ ایک ذرا سمجھایا ہی ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں ڈائن نہیں....."

انہوں نے عابدہ کے بھی لتے لینے شروع کر دیئے۔

فرزانہ شاید ایسی باتوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ امی کو بولتا دیکھ کر ہم سے "ضروری کا" کا بہانہ کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی امی اور عابدہ بھی شاہ صاحب کے ہاں مولود شریف پر چلی گئیں۔

ان کی روانگی کے بعد میں اپنے جہانوں میں لوٹ آئی۔ اپنی دنیا میں جہاں ہی تھی۔ آصف تھا' اور ہمارا شاندار مستقبل تھا۔ میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور کھڑکی کے سامنے رکھا موڑھا سنبھال لیا۔

کھڑکی کھلی تھی لیکن آصف وہاں نہیں تھا۔ میری نظریں بار بار بے چینی سے اس طرف اٹھ جاتیں اور مایوس لوٹ آتیں۔ پھر جیسے میری آنکھوں کی تراوٹ لوٹ آئی۔ آصف میرا خواب میرے سامنے موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔

شاید وہ کالج سے سیدھا اوپر آ رہا تھا اور کالج میں بھی اس نے آج کی "کارنامہ" انجام دیا تھا جو تھوڑی دیر بعد ہی اس کے ہاتھ سے نکلا اور پرواز کرتا میری کھڑکی کے راستے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے لرزتے ہاتھوں اٹھایا اور نیچے کمرے میں چلی آئی۔

نیلے رنگ کا خوبصورت پیڈ تھا جس پر دل بنا کر اس میں تیر ترازو کرنے کے بعد خون ٹپکتا دکھایا گیا تھا اور ایک دردناک قسم کا شعر پیشانی پر تحریر تھا۔ آصف نے لکھا تھا۔

"میری نجمہ!

پچھلے سات آٹھ روز سے میں تمہیں روزانہ چوری چھپے دیکھا
کرتا تھا لیکن تمہارے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اسے
میرا خوف نہ جان لینا ہم پٹھان لوگ جس کے بن گئے جی جان اس پر وار
دیتے ہیں یہ تو رعب حسن تھا جس کے سامنے ٹھہرنے کی مجال میں
نہیں کر پاتا تھا صبح جب تم نے میرے سلام محبت کو شرف
قبولیت بخشا تو گویا تم نے میری ارمندیوں کا بند دروازہ مجھ پر

کھول دیا تھا۔ تم نے جس کیفیت کا شکار مجھے کل رات دیکھا تھا
میں پچھلے پانچ روز سے اس عذاب میں گرفتار ہوں لیکن تمہارا
بند دروازہ کل ہی کھلا۔ شاید قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا۔

میری محبت کو ندی کی سطح پر بننے والا وہ بلبلہ نہ سمجھ
لینا جو تھوڑی دیر بعد اپنی موت مر جاتا ہے۔ اس میں ندی جتنی گہرائی اور
سمندر کی لہروں جتنی طاقت ہے۔

میں نے بڑی طویل ریاضت کے بعد تمہارا "نروان" حاصل کیا ہے۔
تمہاری محبت کی آگ میرے دل کے معبد میں ہمیشہ جلتی رہے گی۔
میں اس کی روشنی میں حیات کے سارے اندھیارے پاٹ لوں گا۔ جب
فرزانہ نے بتایا کہ تم نے سکالرشپ حاصل کیا ہے تو مجھے اپنے
مقدر پر رشک آنے لگا۔ نجمہ! میں ایف۔ ایس۔ سی فائنل ایئر میں پڑھتا
ہوں اور میں نے بھی میٹرک میں سکالرشپ حاصل کیا تھا۔ اب تمہاری
محبت میرے جذبوں کو مہمیز لگائے گی اور میں ایک ولولہ تازہ کے
ساتھ اپنی منزل انجینئرنگ کی ڈگری کی طرف بڑھوں گا اور ایک روز
بامراد ہو کر تمہارے لئے تمہارے والدین کے آگے دامن پھیلا دوں گا۔

ہمیشہ سے تمہارا آصف

اس کا خط تو بہت طویل تھا۔ مجھے اتنا ہی یاد رہ گیا ہے۔ میرے جذبات کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جو زندگی کے ابتدائی مراحل میں ان منازل سے گزرے ہوں۔ دنیا کی کسی زبان کی کسی ڈکشنری میں وہ الفاظ نہیں جو میرے جذبات کو زبان دے سکیں۔ بس ایک نشہ سا تھا جو میرے رگ و پے میں سما گیا اور میں مدہوش ہوتی چلی گئی۔

دنیا کے جابر ترین مرد میری جوتیاں چاٹتے رہے ہیں' میرے ایک اشارے پر بڑے بڑے سورماؤں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا میں جسمانی طور پر کسی بھی مرد کو چیلنج کرنے کی پوزیشن رکھتی تھی' لیکن مجھے صدق دل سے اقرار کرنا ہے کہ عورت بزدل اور خوفزدہ ہوتی ہے اور مرد نے اس کی اس کمزوری کو ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ اسے تحفظ کا احساس دلا کر لوٹا ہے۔ اس کے لاشعور میں رچے بسے خوف کو عجیب عجیب شکلوں میں اس کے سامنے کھڑا کر کے اسے نوچا کھسوٹا ہے۔

یہ ازل سے ہوتا آ رہا ہے اور شاید ابد تک ہوتا رہے گا۔ کیونکہ انسان میں موجود وحشی کبھی نہیں مر سکتا۔

حجری دور کا نظام قبائلیت اس میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آدمی کی بربریت کو تہذیب، تعلیم، مذہب، اخلاق کی گولیاں وقتی طور پر گہری نیند تو سلا سکتی ہیں، مار نہیں سکتیں۔

یہ فلسفہ جو میں نے بیان کیا میرے ذاتی تجربات کی دین ہے۔ ممکن ہے زندگی کو منفی انداز میں مسلسل دیکھنے اور بسر کرنے سے میری سوچ کا انداز بھی نرا منفی ہو کر رہ گیا ہو۔

لیکن ... ایسی بات ہرگز نہیں۔ میرے لاشعور میں جو نیکی میرے دادی اماں نے انجیکٹ کی تھی وہ کبھی مر نہیں پائی جس طرح برائی کبھی نہیں مرتی، نیکی بھی اپنے فاتحانہ وجود کے ساتھ ہر جگہ ہر بے انسان میں موجود رہتی ہے۔ اس بات کا ثبوت آپ کو میری کہانی میں جگہ جگہ ملے گا۔

تب میں صرف بچہ تھی ... !میڈم نہیں تھی۔ میری سوچ عام لڑکیوں کی سی تھی۔ انہی لڑکیوں کی سی جو خواتین کے رسالے پڑھ کر خوابوں میں زندہ رہتی ہیں جو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خواب دیکھتی ہیں جن میں یہ خواہش شدت سے جنم لیتی ہے کہ کوئی انہیں بازوؤں میں بھر کر ان کی دھڑکنوں کو اپنی دھڑکنوں کا حصہ بنا لے لیکن جو اپنے عاشقوں کے خطوں کا جواب اس لئے نہیں دیا کرتیں کہ بدنامی کا خوف انہیں دامن گیر رہتا ہے۔ "مرد کی نیت کا کیا اعتبار۔ جانے کب بدل جائے"۔

یہ سوچ انہیں ہمیشہ بزدل بنائے رکھتی ہے۔ وہ اپنی منزل سامنے دیکھتے ہوئے بھی اس سے پرے ہٹ جاتی ہیں اور زندگی بھر گئے وقت کو روتی رہتی ہیں۔

میں نے بھی تب یہی سوچا تھا کہ میں آصف کو نوٹ کر چاہوں گی۔ اس کی جیون ساتھی بننے کا سپنا میں نے بھی دیکھا تھا لیکن یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اس کے خط کا جواب نہیں دوں گی۔ کہیں کوئی خط کسی کے ہاتھ لگ گیا تو میرا بھرم ٹوٹ جائے گا۔

میری ماں جیت جائے گی اور میں ہر جاؤں گی۔

میں نے وہ خط بار بار پڑھا۔ اس کے ایک ایک لفظ میں چھپے جذبے سے حظ اٹھایا۔ اس کی ایک ایک سطر میں جھلکیاں مارتے اپنے سنہرے مستقبل کا مزا آنکھیں بند کر کے لیا۔ میں ڈاکٹر۔ میرا آصف انجینئر، کتنی شاندار جوڑی ہوگی۔ لوگ ہماری مثالیں دیا کریں گے۔ ہم پر رشک کیا کریں گے۔ ہم سے حسد کیا کریں گے۔

تصور ہی تصور میں میں نے محل بنائے اور ڈھا دیئے۔ ہر مرتبہ کوئی رنگ بھرنا باقی رہ جاتا۔ ہر مرتبہ ان کو نیا رنگ دیتی۔

شام تک میں دوبارہ کھڑکی کھولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ میں نے خط کو تہہ کر کے پہلے اپنے سینے کے نزدیک دھڑکنوں میں سمویا پھر ایک کتاب میں رکھ کر اپنی الماری میں تالا لگا کر محفوظ کر دیا۔ اس تالے کی دوسری چابی میں نے جان بوجھ کر گنوا دی اور واحد چابی میرے پاس محفوظ رہی۔ میں نے مقدس امانت کی طرح اپنی اولین محبت کے

معصوم اور پاکیزہ اوراق محفوظ رکھے اور آج بھی یہ صحیفے میرا سرمایہء حیات ہیں۔

جب کبھی چند منٹ کے لئے ضمیر انگڑائی لے کر زندہ ہوتا ہے۔ مجھے کچوکے لگا کر اپنی پرانی دنیا کی سیر کرواتا ہے، اپنے عورت ہونے کا احساس دلاتا ہے تو یہی خطوط میرا واحد سہارا ہوتے ہیں۔ تب میرے پاس زندگی میں ضمیر کی عدالت میں پیش کرنے کے لئے صرف ایک ہی ثبوت رہ جاتا ہے۔ یہ کاغذ کے پرزے ... جو اپنے اوپر لکھے سچے اور کچے جذبوں میں گندھے لفظوں کی طرح زندہ ہیں۔ لوگ مر جاتے ہیں۔ ممکن ہے یادوں کو بھی موت آ جاتی ہو۔ لفظ کبھی نہیں مرتے۔ جذبے زندہ جاوید رہتے ہیں۔ فضا میں کروڑوں محبت کرنے والوں کے کہے لفظ ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی چاہے دل کی ایک مخصوص فریکوئنسی پر ان کی آواز سن لے، ان کی حقیقت کو جان لے۔

شام کو تھوڑی دیر کے لئے امی اور عابدہ آپیں اور چلی گئیں۔ انہوں نے شاہ صاحب کے گھر بیٹھ کر ہی میرے فسٹ آنے کی خوشی میں ایک "محفل باؤ ہو" برپا کرنے کا پروگرام طے کر لیا تھا اور اب وہ لوگوں کو "سدے" (دعوت نامے) دینے کی مہم پر نکل گئی تھیں۔

والد صاحب رات گئے ہوٹل اور دوستوں کی محفلوں سے فراغت پا کر گھر لوٹتے تھے۔ انہیں بیگم صاحب کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی یا پھر شاید وہ اس "نازک مسئلے" کو چھیڑنا مناسب ہی نہیں جانتے تھے۔ ان کی زندگی کا تو صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ دن رات حرام اکٹھا کریں اور اپنی زوجہ محترمہ کی ہر خواہش کے سامنے بلا چون و چرا ان سر جھکاتے چلے جائیں۔

والدہ اور بہن کے رخصت ہوتے ہی میں نے چولہا سنبھال لیا تاکہ واپسی پر ان کو کھانا تیار ملے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں اپنے آسن پر آن براجی۔ اس لمحے جب میں نے آصف کا چہرہ دیکھا تو مجھے ترس آیا۔ بے چارہ کتنی بے چینی اور بے قراری کے ساتھ وہاں جانے کب سے ٹہل رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے گردن جھکا کر اس پر سر تسلیم خم کیا۔ ہم چاہتے تو ایک دوسرے سے باتیں بھی کر سکتے تھے لیکن یہاں ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی دوسری کھڑکی بھی برابر سے نہ کھل جائے، کسی کی نظر ہم پر نہ پڑے، کوئی ہمیں دیکھ نہ لے، کہیں یہ نہ ہو جائے، کہیں وہ نہ ہو جائے۔

عجیب عجیب وسوسوں کے سانپ کنڈلی مارے ذہن میں کلبلاتے تھے۔

آصف نے ہاتھ کے مخصوص اشاروں سے مجھ سے پوچھا میرے خط کا کیا بنا!

میں جواب میں صرف مسکرا کر رہ گئی۔

دوبارہ اس نے ہاتھوں سے خط پھاڑنے کا اشارہ کرتے پوچھا کیا اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔

میں نے گردن کو نفی میں ہلا دیا اور مسکراتی رہی۔

ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے محبت نامے کا انجام دریافت کیا۔ میں نے اسے ہاتھوں کے اشارے سے تسلی دی کہ مطمئن رہو۔ پھر اس کے اصرار کرنے پر تہہ شدہ خط منہ دوسری طرف پھیر کر دل کی دھڑکنوں سے الگ کر کے اسے دکھایا اور اشاروں سے بتایا کہ میں نے اسے کیا مقام دیا ہے!

آصف کا چہرہ ایسے ندیدے بچے کی طرح خوشی سے اچانک دمک اٹھا جسے دو گھنٹے مسلسل رونے کے بعد اپنی مرضی کا کھلونا نصیب ہوا ہو۔

"جواب دو گی۔" اس نے کھڑکی سے منہ لگاتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور ہاتھ باندھ کر درخواست کی کہ زیادہ جذباتی نہ بنے اور اردگرد سے ہوشیار رہے۔

اس نے دل پر ایک ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ کو منفی انداز سے ہلا کر گویا یہ کہا کہ وہ اس دل بے قرار کے ہاتھوں مجبور ہے اب اس سے صبر نہیں ہوتا۔

"ایسی بے صبری بھی کیا" ۔ ہاں آخر میں بھی سرگوشی میں کہے بنا نہ رہ سکی شاید اس بات کے پیچھے اس کی آتش شوق کو مزید بھڑکانے کا جذبہ کارفرما ہو۔

"کل مجھے ضرور ملنے گا" ۔ اس نے اپنی آواز کو حتی الوسع دبائے رکھا۔

میں اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش ہو رہی۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا۔

"کل نہیں پھر کسی روز۔ واقعے کھلنے والے ہیں نا۔ کسی روز فارم لینے کے بہانے جاؤں گی" ۔ میں نے معذوری ظاہر کی۔

"آپ کل سکول سے سرٹیفکیٹ لینے کے بہانے بھی جا سکتی ہیں" ۔ اس نے بے چینی سے کہا۔

اس لمحے آصف کی اس ادا پر مر جانے کو جی چاہا۔

"گویا آپ نے بہانہ بھی خود ہی ڈھونڈ رکھا ہے میرے جانے کا" ۔

"یہ دل کا معاملہ ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا کروں" ۔ اس نے معذوری ظاہر کی۔

"لیکن جناب ابھی تو میرا رزلٹ بھی پورے سکول نہیں آیا ہو گا۔ یہ آپ بھول گئے تھے کیا" ۔ میں نے اسے یاد دلایا۔

"بات تیرے کی ..." اس نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہا کہ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی پھر اچانک رک گئی کیونکہ آصف سے ملحقہ مکان کی کھڑکی کھلنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں اگلا منظر دیکھنے کے لئے وہاں نہ رکی اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

○

اس رات میں نے ڈر کے مارے کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کی ہمت ہی نہ کی۔ میرے ذہن میں شام ہی سے ایک بے نام سا خوف در آیا تھا۔ کہیں ہمسایوں کو ہم پر شک تو نہیں ہو گیا؟ آخر وہ کھڑکی پہلے کبھی کیوں نہیں کھلی؟

ضرور کوئی چوری چھپے ہماری حرکات نوٹ کر رہا تھا۔

اس خوف نے تو میری بھوک پیاس بھی ختم کر دی بمشکل میں نے چند لقمے ہی زہر مار کئے تھے مبادا گھر والوں کو کوئی شک نہ گزرے اور سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گئی۔

"اب مہارانی نخرے تو کرے گی۔ خیر سے سکول میں دوم جو آ گئی ہے" ۔ امی نے ابو کو بتایا جو آج خلاف معمول ذرا پہلے چلے آئے تھے۔

"زہرا! تم تو کمال کرتی ہو۔ تمہیں تو خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے اس سے" ۔ اس روز نجانے ابو نے اتنی جرات کیسے کر لی۔

"ہاں جی! تم تو خیر سے یہی کہو گے۔ آخر ہو کس ماں کے بیٹے۔ خدا کا شکر کرو اس گاؤں سے نجات دلا کر شہر لے آئی ہوں تو سکول کالج کے نام بھی آ گئے ہیں باپ بیٹی کو ورنہ صاحبزادی کہیں اُپلے تھاپ رہی ہوتی" ۔

امی اپنا یہ احسان کسی نہ کسی بہانے جتاتی رہتی تھیں کہ وہ ہمیں گاؤں سے شہر لے آئی ہیں اور ہمیں شہری ماحول کی برکت سے کچھ تعلیم و تہذیب کا پتہ چل گیا ہے ورنہ ہم تو بالکل گدھے تھے۔

ابو کو علم تھا کہ اب اگر آگے کوئی بات کی تو سلسلہ دور تک نکل جائے گا۔

"اچھا بابا تم جیتیں میں ہارا۔ اگر بدقسمتی سے گھر آ ہی گیا ہوں تو روٹی تو سکون سے کھا لینے دو" ۔ وہ بولے

وہ ساری رات میں نے ڈر ڈر کر گزار دی۔ اگلے روز صبح بھی میں نے کھڑکی نہیں کھولی۔ وہی وہم اب تک موجود تھا۔

"اب کیا ہمیں دم گھٹا کر مارنے کا پروگرام ہے" ۔ امی نے بدستور بند کھڑکی دیکھ کر کہا۔

یہاں ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کا واحد ذریعہ یہ کھڑکیاں ہی ہوا کرتی ہیں۔ روشندان نام کی چیز ان مکانوں میں نہیں پائی جاتی کیونکہ روشندان کی جگہ وہ لوگ ڈر بنا کر رکھنے کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی" ۔ یہ کہہ کر میں دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھی اور کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھول دی۔

کھڑکی کھول کر میں یک دم واپس پلٹ گئی جیسے وہاں کھڑے رہنے پر باہر سے کوئی شے مجھ پر حملہ

آور ہو جائے گی۔ اس کے بعد خوف کے مارے میں پانچ دس منٹ تک کمرے میں نہ گئی۔ پھر چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے بہانے سے چوروں کی طرح اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو خوشی کی ایک لہر میرے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ سامنے آصف کھڑکی کے قریب ناشتہ کر رہا تھا۔

○

مجھے دیکھتے ہی اس کا لقمے والا ہاتھ اُٹھے کا اٹھا رہ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا" ۔ کیا بات تھی کل بھاگ کیوں گئی تھیں؟

میں نے ملحقہ مکان کی طرف اشارہ کر کے خطرے کی نشاندہی کی اور اپنا شک ظاہر کیا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔

آصف نے دائیں ہاتھ کی انگلی کنپٹی کے گرد گھماتے ہوئے شاید یہ کہا کہ تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے نزدیک آنے کو کہا اور بولا۔

"محترمہ! خواہ مخواہ خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں۔ لوگوں کو ہماری طرح صرف یہی نہیں کچھ اور بھی کام ہیں" ۔ اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ میں بے اختیار ہنس دی۔

"کیا بات ہے بڑی خوش نظر آ رہی ہو" ۔ اچانک دوسرے کمرے سے امی کے اس طرف آنے کی آواز سنائی دی اور میں کسی میکانکی عمل کے تابع اچانک ہی اس طرف گھوم گئی۔ آصف نے بھی شاید خطرے کا احساس کر لیا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ جب امی کسی کام سے میرے کمرے میں پہنچیں تو اس کے کمرے کی کھڑکی بند نظر آ رہی تھی۔

"سکول کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔ امی کل..." میں نے ان کے پوچھنے سے پہلے ہی بہانہ تراشا۔

"بس بس جانے دو۔ کبھی اس موئی پڑھائی کے علاوہ بھی کوئی بات کر لیا کر" ۔

انہوں نے میرے کمرے کے ایک کونے میں لٹکتی اپنی چادر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آج تیرے باپ کے دفتر سے لوگ آ رہے ہیں۔ کہیں دفعہ نہ ہو جانا" ۔

○

"باپ" کے دفتر کے افسران اور شاہ صاحب کا ہمارے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی کی دعوت ہمارے ہاں رہتی تھی۔ ان دعوتوں میں "کمائی" کے دھندے بخرے ہوتے۔ رشوت لینے کے نئے محفوظ طریق کار طے کئے جاتے۔ نئے نئے منصوبے ترتیب پاتے۔ فائلوں کو کہاں دبانا ہے۔ کس نے کس طرح "گائیک" کو دوسرے تک پہنچانا تھا۔ فلاں کام سے فلاں کام تک کے ریٹس کیا لئے جائیں گے۔ یہ ساری گفتگو عموماً انہیں دعوتوں میں ہوتی تھی۔

مجھے نفرت تھی ان سب کاموں سے۔ ایسی باتوں سے۔

آج یہ کہتے ہوئے سوچتے ہوئے حیرانگی ہوتی ہے۔ خدایا میں کبھی ایسی پاکباز لڑکی بھی تھی۔

اس روز ایک عجیب سا تجسس میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ میرے اندر خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ میں ان کی گفتگو سنوں اور دیکھوں آخر یہ لوگ کس کس طور سے اپنے شیطان منصوبے ترتیب دیتے ہیں۔

اس دن دفتروں کا "ہاف ڈے" تھا۔ امی نے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے امی "شاہ صاحب" کی منحوس شکل دکھائی دی جس کی موجودگی کے بغیر ہر محفل ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ خدا جانے لوگوں کو اس سے کیا لاڈ ہوتا تھا۔ وہ شکل ہی سے چھٹا ہوا غنڈہ اور پیر کے بجائے کسی بدقماش گروہ کا سرغنہ دکھائی دیتا تھا۔

وہ لوگ میرے سامنے والے کمرے میں بیٹھا کرتے تھے جہاں سے گفتگو کی آواز مجھے صاف سنائی دیا کرتی تھی۔ امی اس کی منحوس صورت دیکھتے ہی "شاہ جی، شاہ جی" کہتی اس طرف بڑھیں لیکن اس کی ہوسناک نظریں حسب سابق امی سے پھسلتی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے آج تک اسے سلام نہیں کیا تھا۔ اس معاملے پر متعدد مرتبہ امی اور میرے درمیان تُو تُو مَیں مَیں ہو چکی تھی لیکن میں نے ان کی یہ بات کبھی نہ مانی۔

میں بچی نہیں تھی۔ جس ماحول میں میری پرورش پچھلے دو سال سے ہو رہی تھی اس میں رہتے ہوئے مجھ سے زیادہ اور کون مرد کی ہوسناک نظروں کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ میں اس کے سامنے سے ہٹی اور اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی جہاں سے تھوڑی دیر بعد ہی امی اور اس کے درمیان باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"شاہ جی! میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔ مولا خیر کرے۔ کوئی مصیبت تو آنے والی نہیں۔؟" امی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"زہراں! بڑے بڑوں کے دانت دیکھے ہیں میں نے۔ مرشد کی دعا سے میرا وار خالی نہیں جا سکتا۔ تو بے فکر ہو جا۔ بڑے بڑے ایماندار آئے اور چلے گئے۔ میں ایک سیکرٹری کو ہاتھ میں لے رہا ہوں۔ ایسی جگہ تبادلہ کراؤں گا کہ یاد رکھے گا۔" شاہ نے جواب دیا۔

خدا خیر کرے۔ میں سہم گئی۔ معاملے کی کچھ کچھ سمجھ مجھے آنے لگی تھی۔ شاید ابو پر کوئی مصیبت آ رہی تھی جس کے تدارک کے لیے امی نے حسب سابق شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیئے تاکہ غور سے اگلی باتیں سن سکوں۔ اپنی اس غیر اخلاقی حرکت پر میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور میں وہیں کھڑی رہی۔

وہ لوگ کسی "بھٹی صاحب" کا ذکر کر رہے تھے جو ابو کے دفتر کا نیا افسر تھا اور نہ تو خود رشوت کھاتا تھا نہ ہی کسی راشی کو برداشت کرنے پر آمادہ تھا۔ اس نے صاف صاف سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس سے پہلے جو کچھ کر چکے ہیں وہ خدا اور ان کا معاملہ ہے۔ آئندہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے گا اور معمولی سی بے ضابطگی پر بھی

کڑی سزا ملے گی۔

یہ بھٹی صاحب اپنی سخت گیری اور ایڈمنسٹریشن کے لیے خاصی شہرت رکھتا تھا اور اسے عموماً حکومت ان دفاتر میں بھیجا کرتی تھی جہاں بے ضابطگیاں اپنے عروج پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی گفتگو نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد میں نے جس قسم کی شوتناک گفتگو سنی اس کا بیان دنیا بھر کے مہذب ترین الفاظ میں بھی ناممکن ہے۔

اس سے پہلے مجھے اپنی ماں پر شک رہتا تھا آج مجھے اس سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ ڈائن تھی۔ مجھے اس لمحے اس بات پر رونا آیا کہ ایسی گھٹیا عورت کے بطن سے میں نے جنم کیوں لیا؟ آخری فقرہ جو میری سماعت سے ٹکرایا وہ یہ تھا؟ "شاہ جی! عقل کرو۔ میں کوئی بھاگی جا رہی ہوں۔ وہ لوگ آنے والے ہوں گے"۔

اس کے بعد وہاں کھڑے رہنے کا حوصلہ مجھ میں نہ رہا۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پاؤں جن پر چل کر میں چارپائی تک پہنچی تھی میرے پاؤں ہرگز نہ تھے۔ شاید کسی نادیدہ ہستی نے مجھے سہارا دے کر وہاں تک پہنچایا تھا۔ شرم اور غصے کے مارے میں مری جا رہی تھی۔ جی چاہتا اٹھ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں یا پھر خودکشی کر لوں تاکہ یہ کہانی بھی میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے۔

لیکن ..... ایک مجبور اور بزدل لڑکی ایسی باتیں صرف سوچا کرتی ہے۔ ان پر عمل اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ کاش میں نے اس لمحے اپنے اس خیال کو کسی طرح عملی جامہ پہنا لیا ہوتا تو آج خدا کی عدالت میں سرخرو ہو کر پیش ہوتی۔ آج زندہ در گور جہنم کے دہانے پر کھڑی ہو کر آپ سے باتیں نہ کرتی۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب عابدہ نے تقریباً مجھے جھنجھوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔

"کہاں پہنچ جاتی ہو تم آج کل کسی کے باپ کی نوکر نہیں کہ سارے کام میں ہی کرتی رہا کروں۔"

میں نہ جانے کب سے سرہانے میں سر دیے رو رہی تھی۔ اپنی آنکھیں مجھے جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ عابدہ کی طرف میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

"خیریت تو ہے۔" اس نے میری حالت دیکھ کر پوچھا

"کچھ نہیں میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ تم میری بہن اکیلی کام کر لو۔ کسی لڑکی کو مدد کے لیے بلا لو"۔

"ایک تمہاری طبیعت بڑی نازک ہے۔ ہم تو جیسے انسان ہی نہیں"۔ بڑبڑاتی ہوئی وہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔

عابدہ نے کھڑکی کھول کر آصف کی بہن فرزانہ کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ مجھے فرزانہ کے بلانے پر افسوس ہوا۔ اس گندے گھر میں کسی ہاکرہ کا آنا جانا مجھے کیسے گوارا ہوتا؟ لیکن کیا کہتی۔ کس سے کہتی؟۔

تھوڑی دیر کے بعد ساری منڈلی اکٹھی ہو گئی۔ وہ لوگ بھٹی صاحب کے معاملے پر بحث کر رہے تھے اور

ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے کہ انہی کی وجہ سے بھٹی کو ان سب پر شک گزرا ہے۔ ان کے درمیان اس جرائم شاہ کو لیڈر کی حیثیت حاصل تھی۔ امی اس ساری گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ والد تو سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی وکالت میری امی ہی کر رہی تھیں۔

رات گئے تک وہ لوگ وہیں جمع رہے، پھر دفع ہو گئے۔ اس دوران فرزانہ میرے پاس کئی مرتبہ آئی۔ وہ مجھے بڑی محبت سے باجی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ شاید آصف نے اسے اعتماد میں لے لیا تھا لیکن میری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ میں تو اس کی گفتگو بھی بڑی بددلی سے سن رہی تھی اور جواب میں صرف "ہوں" "ہاں" کہہ کر رہ جاتی۔

"معاف کیجئے باجی! میں شاید آپ کو بور کر رہی ہوں۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"ارے نہیں! دراصل میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ اس لئے" میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

"بھائی جان بیچارے تو بڑے پریشان ہوں گے آپ کی طبیعت کا سن کر"۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی اور مسکراتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

ایک مردہ سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آصف نے واقعی اسے اعتماد میں لے کر اپنی اور میری محبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ عموماً ایسی معصوم محبتوں کا آغاز یونہی ہوتا ہے۔

خطوط لکھے جاتے ہیں۔ انگوٹھیاں، رومال، اور خوشبوئیں نذر کی جاتی ہیں۔ چوری چھپے پارکوں اور سینماؤں میں ملا جاتا ہے۔ باہمی رابطے کے لیے کسی ایک شخصیت کو اعتماد میں لیا جاتا ہے جو عموماً ہیروئن اور ہیرو کی بہن ہی ہوتی ہے!۔

شاید آج سے ہزاروں سال پہلے جو لوگ محبت کرتے تھے انہوں نے بھی یہی طریق کار اختیار کیا تھا اور صدیوں سے یہ راز سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آ رہا تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اپنے خیالات کے دھارے کا رخ آصف کی سمت موڑ کر اذیت ناک سوچوں سے فرار کی کوئی راہ ڈھونڈوں، لیکن فرار کی راہ نصیب نہ تھی۔

رات کو کھانا کھائے بغیر میں اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ساری رات کربناک سوچیں مجھے ڈستی رہیں۔ کبھی جی چاہتا ابو کو سارے حالات ایک خط کے ذریعے لکھ کر بتا دوں اور خودکشی کر لوں۔ کبھی دل چاہتا کہ ہنڈیا میں زہر ملا دوں اور ہم سب اسے کھا کر مر جائیں لیکن میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پائی۔ بالآخر جس فیصلے نے مجھے مطمئن کیا وہ خاصا مثبت تھا۔

میں نے سوچا اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابو کو امی کے کرتوت کا علم نہ ہو۔ جب وہ خود کئی مرتبہ رات گئے شراب کے نشے میں دھت دوسروں کی بہو بیٹیوں سے منہ کالا کر کے گھر لوٹتے تھے تو امی کے متعلق انہیں کیا غلط فہمی ہوتی؟۔ وہ خود امی کو اپنے افسران کی خدمت میں سفارش کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ اس لیے

ان سے بات کرنا بے سود تھا۔ تایا جی جو کبھی کبھی آیا کرتے تھے' وہ میری صرف اخلاقی مدد ہی کر سکتے تھے۔ میرے سامنے صرف ایک ہی راہ تھی کہ میں جی جان سے محنت کروں' جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر آصف کا ہاتھ تھاموں اور اس گھٹاؤ نے ماحول سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کر جاؤں۔

آصف پر اتنی جلدی اعتماد کرنا بھی عجیب سی بات تھی لیکن انسان جو ہمیشہ خوش فہم رہا ہے خود کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی ڈھکوسلا کوئی بہانہ بھی تراش ہی لیتا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آصف مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ زندگی بھر میرے قدموں سے قدم ملا کر چلے گا۔ یہ ضرور تھا کہ فی الحال اسے اعتماد میں لینا غلط تھا۔

اس فیصلے پر پہنچ کر میں گہری نیند سو گئی۔ صبح جب مؤذن نے خدا کی عظمت کا اعلان کر کے اور نماز کو نیند سے بہتر بتا کر فلاح کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی تو میں نے اٹھ کر اس مالک کائنات کے حضور سجدہ شکر گزارا اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعا کو ہوئی کہ مولا! اب تو ہی میری راہنمائی کر۔ میرے ماں باپ کی خطاؤں سے درگزر فرما کر انہیں صراط مستقیم پر چلا اور میری معصوم بہن کو اس غلیظ ماحول سے محفوظ رکھ۔

نماز پڑھ کر میرا دل خاصا ہلکا ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی بہن ہونے کے ناطے اس بات کا عہد کیا تھا کہ عابدہ کو حتی الوسع کوشش کر کے ماں کے چنگل سے نکالوں اور کوشش کروں گی کہ اس کے میرے پاؤں میں کمی آ جائے۔

صبح میں نے کھڑکی کھول کر اپنے محبوب کے درشن کیے اور اسے نوید دی کہ آج میں داخلہ فارم لینے جا رہی ہوں۔

ناشتہ کر کے میں تیار ہو کر چل دی۔ بازار کے ایک کونے میں آصف میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ بڑی ہوشیاری سے ہم ایک دوسرے سے بظاہر لاپرواہ ایک دوسرے کی دھڑکنوں پر چلتے چلے جا رہے تھے۔

کالج کے بس سٹاپ پر اتر کر وہ بے دھڑک میرے نزدیک آ گیا۔

"میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔ فارم لے کر آ جاؤ"۔ اس نے میرے نزدیک آ کر کہا۔

میں نے چاہا "نا" کر دوں لیکن یہ صرف ذہن کا فیصلہ تھا دل کا نہیں۔ دل تو جانے کب سے آصف کے سنگ بیٹھ کر اس سے زمانے بھر کی باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ میں مسکرا دی اور وہ باہر رک گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ایک رکشہ میں بیٹھ کر ایک ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ خدا جانے آصف نے پہلے ہی سے یہ ہوٹل تاڑ رکھا تھا یا اسے معلوم تھا کہ ہم جیسوں کے لئے اس شہر میں یہی گوشہ عافیت ہے۔

رکشہ میں شرم کے مارے میں دبی ہوئی جاتی تھی۔ زندگی میں کسی غیر مرد کے نزدیک بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ آصف بولتا رہا۔ میں سنتی رہی مجھے یہاں بھی یہ خوف دامنگیر تھا کہ رکشہ والا شیشے میں ہم دونوں کو باتیں کرتے دیکھ رہا ہو گا۔

"ہیلو ہیلو" چھوٹا سا سٹیک بار تھا۔ اس کے خوابناک ماحول میں بیٹھ کر آصف نے مجھ سے جی بھر کے باتیں کیں۔ اس نے اپنا سارا ذخیرہ الفاظ میری تعریف میں خرچ کر ڈالا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ سوائے موت کے اور کوئی طاقت اس کے اور میرے درمیان دیوار نہیں بن سکتی۔ اس کے ایف ایس سی کے امتحانات ہونے والے تھے۔ وہ اپنی اعلیٰ پوزیشن کے لئے بڑا پر اعتماد تھا۔

اس روز اس کی شخصیت سے متعلق دو باتیں میرے ذہن میں گھر کر گئیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ کوئی عام قسم کا لونڈا نہیں۔ خصوصی اہمیت کا حامل لڑکا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کا مستقبل بہت روشن بہت تابناک ہے۔ اس نے مجھے ایف ایس سی میں رکھنے والے مضامین اور ان کی باریکیوں سے آگاہ کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ میرے ڈاکٹر بننے کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ اپنی سی کر گزرے گا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب ہم ہوٹل سے باہر آئے تو میں نے کل کے سارے واقعات بھلا دیئے تھے۔ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی تصور کر رہی تھی۔ اعتماد کی دولت سے مالا مال میرا ہر قدم گھر کی سمت ایک نئے عزم اور ولولہ تازہ کے ساتھ اٹھ رہا تھا۔

ہوٹل سے کچھ دور ایک بس سٹاپ پر پہنچ کر ہم الگ الگ ہو گئے۔ ہم نے اگلی ملاقات کے لئے ابھی سے منصوبہ بندی کر لی تھی۔ مختلف اشارے مقرر کر لئے تھے۔ آصف نے بتایا فرزانہ اس کی بہت پیاری بہن ہے اور اس نے اسے اعتماد میں لے لیا ہے۔ فرزانہ اس کے اس فیصلے پر بہت خوش ہے وہ تو خود یہی چاہتی تھی کہ اس کا بھائی اپنے جیسی لائق فائق لڑکی کو جیون ساتھی بنائے۔

(۲)

گھر پہنچی تو قیامت ٹوٹ گئی۔

"باجی! باجی! ہم لوگ تھوڑے دنوں تک نشاط پورہ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ ہائے اللہ ابو نے بڑی خوبصورت کوٹھی کرائے پر لی ہے شکر ہے خدایا اس ذلیل مکان سے تو نجات ملے گی..... عابدہ نے مجھے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا۔ وہ نجانے کیا کیا کہتی رہی۔

اللہ کسی کی محبت کو یوں نظر نہ لگا کرے۔ آغاز سفر ہی میں کوئی یوں نہ لُٹے جیسے میں لُٹی ابھی تو ہمارے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ ابھی تو طویل مسافتوں کی سمت ہم نے قدم اٹھائے ہی تھے۔ راہ محبت میں ابھی تو مجھ سے پہلا باقاعدہ گناہ ہی سرزد ہوا تھا۔ یہ ایک ملاقات کی اتنی مہنگی قیمت۔ یہ چند پل کی خوشیوں کا اتنا مول۔ کیسا انصاف تھا مالک تیرا؟

عابدہ کی بات سنتے ہی میری تمام حسیات کو جیسے موت آ گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اچانک کلیجے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ کالج کا داخلہ فارم ہاتھوں میں پکڑے کانپ کانپ گیا۔ لرزتے قدموں سے میں اپنے کمرے کی طرف چل دی اور بے دم سی ہو کر بستر پر جا گری۔ سانسوں کا تانا بانا منتشر ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

چارپائی پر لیٹے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چھت زمین پر اور زمین چھت پر آ رہی ہے۔ جیسے نظام حیات کے تمام سیارے اپنے مدار سے ہٹ کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔ ایک آگ سی دل میں پھیلنے لگی

ہائے اولین محبتوں کی کیسی مبارک ساعتیں ہوتی ہیں وہ۔ ان دکھوں میں بھی کیسی لذت سرور ہوتا ہے۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ دل بھر آیا۔ پھانس سی گلے میں اٹک گئی۔ میں بے سدھ ہو کر لیٹ رہی۔ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ شام گئے آنکھ کھلی تو جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ عابدہ کے ساتھ ایک ڈاکٹر کی دکان پر گئی۔ اس نے انجکشن لگا کر دوائی اور گولیاں پلے باندھ دیں۔ گولیوں نے معدے تک پہنچتے ہی مجھے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

علی الصباح جب آنکھ کھلی تو جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ طبیعت میں ذرا سی تندی سی تھی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور خالق کے حضور روتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیے۔ ضرور یہ میری کسی کرنی کا پھل تھا جو ابتدا ہی میں جدائی مقدر ہو گئی تھی۔ نماز کے بعد طبیعت خاصی ہلکی ہو گئی۔

ناشتے سے فراغت پاتے ہی امی اور عابدہ کے روکنے کی پرواہ کیے بغیر "فارم داخل کروانے" کالج روانہ ہو گئی۔ آصف پروگرام کے مطابق کالج کے باہر میرا منتظر تھا۔ فارم جمع کروا کر میں باہر آ گئی۔ رکشہ میں تو میں نے ضبط کیے رکھا لیکن جیسے ہی ہم ہوٹل کے کیبن میں بیٹھے پیمانہ صبر چھلک گیا۔ میرے لاکھ ضبط کے باوجود آنسوؤں کا تیز دھارا پھوٹ نکلا۔ اپنی ہچکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے میں نے آصف کو "ہجرت" کی خبر سنائی۔

پہلے تو اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ شاید وہ میرے سامنے بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور خود بھی سوگوار ہو کر میرا حوصلہ توڑنے سے گریزاں تھا۔

"پگلی! اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ نشاط پورہ یہاں سے ہے کتنی دور۔ میں روزانہ تم سے ملا کروں گا۔ آخر تم کالج تو آیا کرو گی۔" اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ پھر زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔ "حضور! اگر کہیں تو گھر کے سامنے دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔" میں بے اختیار مسکرا دی۔

آنسوؤں سے بھیگی وہ مسکراہٹ کیسی ہوگی؟ یہ تو میں نہیں جانتی لیکن وہ لمحے سرمایہ حیات بن گئے ہیں۔ اگر یہ مقدس یادیں بھی میرا زادِ راہ نہ ہوتیں تو جہنم کے یہ رگزار جو آج میں پار کر چکی ہوں کبھی کی ان کے درمیان ہی کہیں بھسم ہو کر رہ جاتی۔ جانے کیسی کیسی عذاب ناک بستیوں سے گذری ہوں میں۔ کیسی کیسی المناک گھڑیاں بیتی ہیں مجھ پر لیکن میں نے ان مقدس امانتوں کو وقت کی آندھیوں، بگولوں، طوفانوں سے ہمیشہ بچا کر رکھا ہے۔ اپنے جی جان سے بڑھ کر ان کی حفاظت کی ہے میں نے۔

آصف نے مجھے امید دلائی کہ وہ کبھی ان باتوں کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ کبھی ایسی مجبوریوں اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنیں گی۔ اس نے مجھے دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کی اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اپنا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا کروں گی۔

میں ڈولی میں نہیں بیٹھی۔ سہاگن نہیں بنی میں۔ میرے سپنوں کو ایک ایک کر کے موت آئی ہے۔ میرے ہاتھوں میں کبھی مہندی نہیں رچی، لیکن مجھے علم ہے رخصتی کے وقت دلہنوں پر کیا گزرتی ہے۔ بابل کے آنگن سے جدائی کے سے نینوں سے کیسے ساون کی جھڑیاں لگتی ہیں۔

میں شہر والے مکان سے رخصت ہوتے ہوئے فرزانہ سے لپٹ کر بری طرح روئی تھی۔ اس کھڑکی کی ملاقاتوں کو جن سے گزر کر آصف کا پیام محبت مجھ تک پہنچا تھا، چوم چوم کر آنسو بہائے تھے میں نے۔ اپنے بوسیدہ کمرے کی ایک ایک دیوار سے لپٹ کر میں نے اپنے لٹنے کی دہائی دی تھی۔

"باجی! میں آپ سے ملنے آیا کروں گی۔" فرزانہ نے روتے ہوئے گلے سے کہا۔

"ضرور آ فرزانہ! مجھے بھول نہ جانا۔" میں نے سسکی لی۔

"آپ کو کوئی بھول نہیں سکتا باجی! آپ بہت پیاری ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔" فرزانہ نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "ہم آپ کو دلہن بنا کر واپس لائیں گے باجی!" ..... اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میرا دل بھر آیا

نشاط پورہ نو دولتیوں کی آباد تھی۔ نئی کالونی۔ نئے لوگ۔ نئی قدریں۔ نئی دوستیاں۔ بالکل الگ ماحول تھا شہر سے یہ۔ میری ماں نے فریج تو خیر سے وہیں رکھا ہوا تھا۔ یہاں پہنچی تو سب سے پہلے گھر میں اس مسئلے پر ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ہمسائے میں سب کے ہاں رنگین ٹیلی ویژن ہیں ہمارے ہاں بلیک اینڈ وہائٹ۔

رنگین ٹیلی ویژن آ گیا۔

نیا فرنیچر آ گیا۔

پردے بدل گئے۔

نئی کٹلری آ گئی۔

فرمائشیں بڑھنے لگیں۔ والد صاحب کے ہاتھ لمبے ہوتے گئے۔ دعوتوں کا زور بڑھنے لگا۔ انہوں نے یہ بات جیسی بھلا ہی دی کہ بھٹی صاحب کی شکل میں ننگی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہے جو کسی بھی لمحے ان پر گر سکتی ہے۔

میں نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے تیسرے روز آصف سے ملاقات ہونے لگی۔ ہم نے پتھروں اور درختوں پر اپنے نام لکھنے شروع کر دیئے۔ دریا کنارے زمین پر دل بنا کر اس کے دھڑکنوں میں دونوں کو سونے لگے۔ ہم ان کنجوں میں گھومنے لگے جہاں کوئلیں سندھیا کے گیت گاتی ہیں۔ ہم نے دریا کی لہراتی بل کھاتی لہروں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کے سنگ سنگ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ باغوں میں دوڑتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر "اک مک" رہنے کے پیمان باندھے۔

درختوں کی اوٹ میں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کا شمار کیا لیکن ہمارے پیار کے تقدس کی انتہا تھی کہ کبھی آصف نے میرے لب لعلین کی مسکراہٹ چرانے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہماری محبت طوفانی 'لافانی اور زندہ جاوید تھی۔

آصف ہر ملاقات پر مجھ سے تعلیمی رپورٹ طلب کرتا۔ ٹیسٹ میں آنے والے نمبروں کا جائزہ لے کر ہدایتیں دیتا۔ جب میں نے فسٹ ایئر پاس کیا تو اس کا بھی رزلٹ نکلا اور میرا محبوب اپنے کالج میں ٹاپ کر گیا۔

"یہ سب تمہاری دعاؤں کا ثمر ہے۔ تمہاری محبت کا اثر ہے۔ تم میری کامیاب زندگی کا آغاز ہو۔ تمہیں پا

کر میں زندگی کے ہر میدان میں سرخروئی حاصل کروں گا۔ تم میرے عزم کو مہمیز لگاتی ہو۔" اس نے اس روز بے اختیار مجھے اپنی دھڑکنوں میں سموتے ہوئے کہا۔

میں خود کو کسی اور عالم کی مخلوق جان رہی تھی۔ کتنی خوش تھی میں۔ گھر سے اس دوران میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے کبوتر بلی کے خطرے سے بند کرتا ہے۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ آصف تھا' کالج تھا یا کتابیں تھیں۔ گھر میں کون آیا؟ کون گیا؟ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ مجھے تو اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ اس "مہذب آبادی" میں آ کر امی نے پر پرزے پھیلانے شروع کر دیے ہیں اور اب انہیں اپنی "خاندانی صلاحیتوں" کے عطا کردہ جوہر کھل کر دکھانے کے لئے صحیح میدان میسر آ گیا ہے۔

ہمارا گھر کالونی کے تمام نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے پناہ گاہ بنتا جا رہا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بہانے کوئی تقریب برپا کر کے امی ان لوگوں کو آپس میں کھل کر ملنے کے موقع فراہم کرتیں اور اس کے بدلے میں ان سے تحائف وصول فرماتیں۔ کسی کو شک نہ گزرتا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جوڑا کسی نہ کسی بہانے سے ہمارے ہاں آ جاتا۔ امی بڑی تیزی سے اپنی اصل کی طرف لوٹ رہی تھیں۔

اس روز پھر ایک خاص میٹنگ ہمارے گھر پر منعقد ہوئی۔ ایک کلرک رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اس نے پولیس کے سامنے سب سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس پر آنچ بھی آئی تو وہ سب کو بھسم کر کے رکھ دے گا۔ اس بے چارے تک تو بمشکل پندرھواں بیسواں حصہ پہنچتا تھا۔ کھاتے تو بڑے افسران تھے۔ اس نے للکارتے ہوئے کہا تھا کہ وہ سارے مگرمچھ گرفتار کروائے گا۔ اس بات نے سب کی نیند حرام کر دی تھی۔

سب کا بلڈ پریشر گھٹنے بڑھنے لگا تھا۔ ان کی منحوس صورتوں پر لعنت برسنے لگی تھی۔ سب کو اپنے بچاؤ کی فکر نے گھن لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس روز اس چنڈال چوکڑی کا گرو گھنٹال شاہ بھی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی جان کو رو رہے تھے۔ سب بری طرح پھنسنے والے تھے۔

شاید قانون قدرت حرکت میں آ گیا تھا۔ ان پر حد نافذ ہونے ہی والی تھی۔ کوئی دم جاتا تھا کہ انہیں جوابدہی کے لئے کٹہرے میں جانا پڑتا۔

میرے والد کی تنخواہ سے زیادہ ہمارے مکان کا کرایہ تھا۔ شاہانہ ٹھاٹ باٹھ الگ تھے۔ والدہ کے چاؤ چونچلے نوابزادیوں سے کم ہرگز نہیں تھے۔ یہ سارا دھندہ جو چل رہا تھا تو پیسے کے سر پر۔ اتنا بے تحاشہ پیسہ یونہی تو آ نہیں جاتا۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار مچا رکھی تھی ان لوگوں نے۔ لیکن اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

سوائے میری امی کے باقی سب کے جیسے موت آ گئی تھی۔ ایک ان کی آواز میں وہی طنطنہ تھا۔

"نیاز محمد! گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں خود ملوں گی تمہارے اس بھٹی صاحب سے۔" ان کے دفع ہوتے ہی امی نے والد سے کہا۔

"وہ تیرے بس کی بات نہیں زہراں! سفارش کا تو اس پر الٹا اثر ہوتا ہے۔" ابو نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

"تو گھبراتا کیوں ہے۔ میرے پاس ایسی ایسی سفارش رکھی ہے کہ بڑے بڑے صوفیوں کا ایمان ڈگمگا جائے۔" والدہ نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

اس "ایسی ایسی سفارش" کا مطلب ابو کی تو سمجھ میں آیا ہو یا نہیں؟ میں بخوبی جان گئی۔

یہ وہ بدبخت اور معصوم لڑکیاں تھیں جو "آنٹی" کو دوست جان کر اپنے دوستوں کے ساتھ اس کے ہاں آیا کرتی تھیں۔ ان کی کمزور رگیں۔ میری ماں کے ہاتھ میں تو تھیں۔ جب چاہتی کسی کو بھی بلیک میلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ڈھب پر لے آتی.....اور!

اس نے ایسا کیا بھی۔ یہ الگ بات کہ منہ کی کھائی۔ بھٹی صاحب نے میری ماں اور اس کی "بھانجی" کو جھڑکیاں دے کر گھر سے نکال دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ والد صاحب کی نگرانی اور سخت ہو گئی۔

شاہ جی کے کہنے پر ساری چنڈال چوکڑی محتاط ہو گئی تھی لیکن یہ کافر منہ کی لگی ہوئی چھٹتی کہاں ہے۔ ایک روز جب والد کی رال ٹپکی تو بھٹی صاحب نے ہاتھ ڈال ہی دیا۔ اگلے روز انہیں محکمانہ تحقیقات کے خاتمے تک معطل کر کے گھر بھیج دیا گیا تاکہ وہ غیر جانبدارانہ تفتیش پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کریں

اس روز والد گھر آئے تو میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ وہ ذرہ برابر گھبرائے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"زہراں! ایک در بند تو سو در کھلے۔" انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اور کیا نہیں تو۔ دیکھوں گی اس ایماندار کی اولاد کو بچو کو ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو زہراں نام نہیں۔"

اس روز ساری رات میاں بیوی بھٹی صاحب کو گالیاں دیتے رہے۔ اگلے روز علی الصباح میری آنکھ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے کھلی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی جہاں ایک تھانیدار اور چار پانچ سپاہی والد صاحب کو گھیرے میں لئے کھڑے تھے۔

زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

دل دھک سے رہ گیا میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں پولیس کو دیکھتے ہی مجھے سارے معاملات کی سمجھ آ گئی تھی محکمانہ تفتیش نے والد صاحب کو مجرم ثابت ہونے پر پولیس کیس کروا دیا تھا اور اب پولیس ملزم کو گرفتار کرنے آئی تھی عابدہ تو ڈر کے مارے کمرے سے باہر ہی نہیں آئی تھی کہ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں لیکن ایک ہستی ابھی تک مطمئن تھی۔

امی.....!

امی نے بڑے نرم لہجے میں ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

"ہم نیاز محمد کو گرفتار کرنے آئے ہیں" تھانیدار نے نظروں ہی نظروں میں امی کو تولتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن کس جرم میں؟" اس مرتبہ امی کا لہجہ ذرا سخت تھا

"جرم کا پتہ بھی تھانے جا کر لگ جائے گا" تھانیدار نے پولیس کا مخصوص لہجہ اختیار کر لیا۔

"آیئے آپ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھئے" امی فوراً ڈھیلی پڑ گئیں۔

"نہیں! نہیں! چلو تم تھانے چلو" اس نے والد کو اشارہ کیا ایک حولدار اپنی بیلٹ سے منسلک ہتھکڑی کھولنے لگا میرے گرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی حلق خوف اور شرمندگی کے مارے خشک ہو رہا تھا اگر میں چیخنا چلانا بھی چاہتی تو چلا نہ پاتی احساس ندامت نے مجھے زمین میں گاڑ دیا تھا لیکن یہ صرف میری حالت تھی میری ماں کا دم خم وہی تھا۔

"آیئے جی! بیٹھئے تو سہی" اس دفعہ انہوں نے خالص بازاری لہجے میں تھانیدار کو مخاطب کیا تھا۔

ان لہجوں اور زبانوں کے پیچھے چھپے مطالب کا گیان پولیس سے زیادہ اور کسے ہو گا وہ تو ایسی چیزوں کے منتظر رہتے ہیں۔

تھانیدار نے پولیس والی نظروں سے پہلے امی کی طرف پھر منہ پھیر کر میری طرف دیکھا شاید وہ امی کے "اثاثے" جانچ رہا تھا میں نے منہ پھیر لیا اور اپنے نیم مردہ وجود کو گھسیٹتی کمرے میں واپس چلی گئی تھانیدار نے سپاہیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور امی اور ابو کے ساتھ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا میرے کمرے میں عابدہ سہمی سکڑی ایک کرسی پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ "باجی" کہہ کر میری طرف لپکی اور ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رونے لگیں۔

قریباً چار پانچ منٹ بعد اچانک کمرے کا دروازہ کھلا امی بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔

"کون مر گیا ہے تمہارا" انہوں نے غصے سے کھولتے ہوئے ہمیں ڈانٹ پلائی۔

ایک بیٹی کے منہ سے یہ بات آپ کو عجیب تو لگے گی آپ مجھ سے نفرت تو کریں گے کیونکہ آپ کے پاس کہنے کے لئے ایک بات بہرحال موجود ہے۔ کہ کچھ بھی ہو وہ میری ماں تو تھی لیکن اب میں منافقت نہیں کروں گی سچ سچ سب کچھ کہہ دوں گی اس لمحے میرا خون غصے سے ابلنے لگا میرا جی چاہا آگے بڑھ کر اس عورت کا منہ نوچ لوں جو بدقسمتی سے میری ماں بھی تھی۔

"چابی کہاں ہے سیف کی؟" امی نے عابدہ کو مخاطب کیا۔

"میرے سرہانے کے نیچے رکھی ہے" عابدہ نے روتے ہوئے کہا

"چپ کر جا۔ الو کی پٹھی!" امی ہمیں صلواتیں سناتی چلی گئیں۔

میں روتے روتے چپ ہو گئی ایک عجیب طرح کی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی مجھے بجائے ندامت کے غصہ

آئے دن کا ہی پرابو پر عابدہ پر اور سب سے بڑھ کر خود پر "کیا میں واقعی بزدل ہوں؟" میں نے سوچا

○

پولیس والے خالی ہاتھ اور بھری ہوئی جیبوں سے رخصت ہو گئے امی بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکل گئی تھیں اور والد صاحب گھر ہی پر رہے ان سب کے رخصت ہوتے ہی انہوں نے ہمیں ننگی گالیاں دینی شروع کر دیں انہیں اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر ہم والدین کو اکیلا چھوڑ کر رونے دھونے میں کیوں مصروف ہو گئی تھیں۔

اندازہ فرمایا آپ نے! یہ تھے ہمارے والدین

دادی کی تربیت نے مجھے پاکیزہ اور باکردار رہنا سکھایا تھا لیکن صرف زبانی تربیت دی تھی۔ کوئی تعویذ گھول کر میرے اندر نہیں ڈالا تھا کہ یہ نظریات میرے خون میں گردش کرنے لگتے میری رگوں میں میرے باپ کا خون تھا رنگ بھی انہی کا چڑھنا چاہئے تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ میرے سوچنے کا انداز منفی ہوا۔

بغاوت کا خفتہ آتش فشاں میرے دل و دماغ میں کب سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا لاوا پک چکا تھا آج اسے پہلی مرتبہ بہنے کی راہ نصیب ہوئی جانے کب سے اپنے اندر انگڑائیاں لیتی دادی اماں کو میں تھپکیاں دے کر سلا رہی تھی بالآخر وہ سو گئیں اب میرے اندر میری ماں بیدار ہو گئی تھی اور یہی میری بربادی کا آغاز تھا۔

میرے ذہن میں بغاوت کا جو سانپ کلبلانے لگا تھا اس نے سب سے پہلے مجھے ہی ڈسا میں اپنے زہر کا پہلا شکار بن گئی۔

وہ بیٹیاں جنہیں بے غیرتی کے خوف سے لوگ زندہ درگور کر دیا کرتے تھے بڑی خوش قسمت ہوں گی مجھے تو ہوس کے مارے والدین نے مرنے سے بچا کر اپنے ہاتھوں زندگی کے جہنم میں جھونکا تھا میں حرص و ہوس کے لپکتے شعلوں سے کب تک اپنا دامن چھڑاتی کہاں تک خود کو چیخنے سے محفوظ رکھتی آخر کو میری حیثیت تھی کیا؟ ایک ناتواں بے کس لڑکی۔

میرے ذہن میں پہلی بات یہی آئی کہ نیکی صرف ڈکشنری میں لکھا جانے والا لفظ ہے عملی زندگی میں اس کا وجود ہوتا تو آج پولیس خالی ہاتھ کیوں جاتی؟ جب ثبوت مل گیا تھا تو ملزم کے بچ جانے کا جواز کیا تھا؟

میری پاکیزگی خون ہونے لگی میں نے سوچا یہاں تو جس کی لاٹھی ہو گی وہی بھینس ہانک کر لے جائے گا میں نے سوچا یہ لوگ تو مجھے بھی ہانک کر لے جائیں گے میں کمزور بھینس بن کر نہیں لٹھ بردار بن کر جینا چاہتی تھی۔

○

صبح کالج پہنچی تو میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ مارشل آرٹس سکھانے والی ٹیم کے سامنے پیش ہو گئی یہ ٹیم ہمارے کالج میں لڑکیوں کو ایک خصوصی کورس کروانے آئی تھی اس حرکت کا محرک بظاہر تو انتقام کا جذبہ ہی تھا

لیکن کس سے؟ اس بات کی مجھے سمجھ نہ آ سکی۔

اصل میں جب میرے ذہن نے طاقت کے وجود کو تسلیم کر لیا تو یہ تحریک خود بخود میرے اندر پیدا ہونے لگی کہ یہ دنیا کمزوروں کے لئے نہیں نہ ہی معاشی معاشرتی طور پر کمزور لوگوں کے لئے اور نہ ہی جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے لئے۔

اپنی نسوانیت پر یہ میرا پہلا بھرپور حملہ تھا۔

میرا آغاز ہی بڑا تیز اور جذباتی تھا پہلے روز جب ایک بلیک بیلٹ جو نجانے کتنے "ڈان" تھا اور جس کے چہرے کی بناوٹ ہزاروں سال پرانے تبتی لاماؤں سے ملتی جلتی تھی نے مجھے کھڑے کھڑے ہاتھ جھکا کر زمین چھونے کو کہا اور میں نے جھٹ سے وہ عمل کر دکھایا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"ویل ڈن تم بہت آگے نکلو گی۔"

آگے نکلنے کا یہ میرا پہلا قدم تھا آج میں جہاں پہنچ چکی ہوں اس سے آگے کوئی اور راستہ نہیں جاتا زندگی کے اس چوراہے تک پہنچ کر ہر سمت میں صرف پسپائی باقی رہ جاتی ہے آگے صرف موت ہے موت اور موت کو گلے لگانا لفظاً تو ممکن ہے عملاً بہت مشکل۔

وہ لوگ جو دن میں دو تین مرتبہ حالات کے ہاتھوں مرنے کی آرزو کرتے ہیں اپنی نیت میں پر خلوص ہوتے ہیں لیکن مرنے سے پہلے آدمی جس دہشت ناک موت کا تصور ذہن میں باندھ لیتا ہے اس کے بعد مرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

پہلے روز جب میری سہیلیوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے "مارشل آرٹس" سیکھنے شروع کر دیئے ہیں تو انہوں نے خیرت سے خبر سنانے والی کو دیکھا اور اس وقت کسی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا جب تک مجھے اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ کرتے دیکھ نہیں لیا۔

"پاگل ہو گئی ہے"

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا"

"جب تین چار روز بعد ہڈیاں ٹوٹنے لگیں تو صاحب زادی کو دیکھیں گے"

"کمال ہے اتنی ایگریشن یا تو بھیگی بلی بنی بیٹھی رہتی تھی"

مختلف لوگ

مختلف زبانیں

مختلف ریمارکس۔

لیکن یہاں ایک عزم تھا کہ ثابت قدم رہا۔

○

امی کی واپسی اس خبیث شاہ کے ساتھ ہوئی تھی اور ان کے ہاتھوں میں ضمانت نامہ تھا انہوں نے ابو کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کروالی تھی۔

"بچے ہیں اپنے کس کی ہمت ہے جو اس شہر میں رہ کر ماکھے شاہ کی بات ماننے سے انکاری ہو" اس نے میرے والد کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! ہم بھی سب بات سمجھتے ہیں" ..... والد کا لہجہ اس لمحے بڑا گھناؤنا تھا۔

"نیاز محمد؟ حوصلہ رکھ اگر تیرے بھئی کا مکو نہ ٹھپ دیا تو سیدانی کا جنا نہ بتائیو" مجھے کمرے کے سامنے سے گذرتے دیکھ کر وہ کچھ زیادہ ہی خرافات بکنے لگا۔

عابدہ نے حسب سابق ان کے لئے چائے تیار کی میری والدہ ایسی خوش نظر آرہی تھی جیسے اس نے بڑا میدان مارا ہے شاہ اور اس کی آنکھوں میں لہراتی شیطانی چمک سے مجھے گھن آنے لگی تھی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور مسہری پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"آصف کو اپنی اصلیت بتلا دوں" اچانک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن پر لہرایا۔

"نا..... نا..... پگلی! کبھی بھول کر بھی یہ خیال دل میں نہ لانا مرد ذات ہے بد گمانی کا شائبہ تک اس کے دل میں پیدا نہ ہونے دینا" عقل نے رہنمائی کی۔

"لیکن یہ غبار پھر چھٹے گا کیسے؟ کسی نہ کسی کو راز دار تو بنانا ہی ہو گا" میں نے دلیل پیش کی۔

"خاموش ہو جا..... زبان اور ذہن کے سارے دریچے بند کر کے بیٹھی رہ خبردار یہ تیری معمولی سی غلطی ساری زندگی کا روگ بن جائے گی..... اگلی وارننگ اور.....

میں نے واقعی سب کچھ بھلا دیا میرے ذہن میں میرے تئیں لاءوس جیسی شکل والے انسٹرکٹر کے الفاظ گونجنے لگے۔

"ویل ڈن تم بہت آگے نکلو گی"

احساس تفاخر سے میری گردن خود بخود تن گئی میں نے تصور ہی تصور میں خود کو آسمانوں پر جھولا جھولتے دیکھا اور اٹھ کر دوبارہ اپنے کمرے کے دروازے کے بولٹ کا جائزہ لینے کے بعد وہی ورزشیں دہرانے لگی جن سے میرا واسطہ صبح پڑا تھا۔

جسم میں میٹھا میٹھا درد اٹھا تو بجائے سمجھنے کے مجھے مزہ آنے لگا ذہن میں آنے والے تمام خیالات کو جھٹک کر میں نے خود کو ڈاکٹر بہار اور نجمہ اور آصف کی تکون میں پھنسا لیا میری زندگی اب ان تینوں زاویوں کا مجموعہ تھی مجھے

ڈاکٹر بننا تھا مارشل آرٹس میں مہارت حاصل کرنا تھی اور آصف کو جیون ساتھی بنانا تھا!

رات گئے تک میں اپنی دنیا میں مگن رہی گھر میں ہونے والی سرگرمیوں سے بالکل لاپرواہ گھر سے بیگانہ اور اپنے حال میں مست رات بستر پر لیٹی تو آصف سے اگلے روز کی گفتگو کا خاکہ تیار کرنے لگی۔ اگلے روز حسب پروگرام کالج سے چھٹی پر آصف میرا منتظر تھا تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ایک گوشہ عافیت اپنے لئے ڈھونڈ چکے تھے

"مجھے داخلہ مل گیا" اس نے بیٹھتے ہی خوشخبری سنائی۔

میں نے "داخلہ لے لیا" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا آصف نے حیرانگی سے میرے چہرے کی طرف دیکھا "خیریت"

"ہاں بس یونہی ذرا سوچا کے لئے" ..... مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔

"کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو کیسی سوچا؟ کہاں داخلہ لے لیا؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"پاگل خانے میں" میں نے بظاہر ہنستے ہوئے بات ٹالنا چاہی لیکن میری ہنسی کے کھوکھلے پن کو اس نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

"دیکھو نجمہ! مجھے پریشان نہ کرو صاف صاف بات بتاؤ" اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس طرح اسے مطمئن کروں بات منہ سے نکال کر میں پھنس گئی تھی کئی بہانے سوچے لیکن آصف سے جھوٹ بولنے کو دل نہ چاہا۔

"مارشل آرٹس کی کلاس میں" ..... میں نے چائے کا کپ بنا کر اس کی طرف کھسکایا۔

آصف نے اچانک اس طرح چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"میں سمجھا نہیں" ..... اس نے چائے کی پیالی میں چمچ گھماتے ہوئے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"..... ایڈونچر ....." میں نے مختصر جواب دیا لیکن آصف کسی بچھو ڑے میں کھیلنے یا انگوٹھا منہ میں لے کر چوسنے والے بچے کا نام نہیں تھا۔

"نجمہ! میں نے اپنی زندگی کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے رکھ دی ہے اس کے ورق ورق پر کیا لکھا ہے تم بخوبی پڑھ سکتی ہو مجھے الجھن سی ہونے لگی ہے تمہارے گول مول جوابوں سے کھل کر سب کچھ کہہ دو..... مجھ سے کچھ چھپاؤ گی؟ یہ تمہارے لئے کیسے ممکن ہے نجمہ! ہم کوئی دو نہیں ہیں" اس کا لہجہ خاصا گمبھیر ہونے لگا تھا۔

آصف کے لہجے میں اس لمحے جو درد چھپا تھا وہ مجھے رلا گیا ذرا سی ہمدردی ملتے ہی میرے اندر کا زہر باد پھٹ گیا آنسو حلق میں گرنے لگے آنکھیں جلنے لگیں اور ایک پھانس حلق کے عین درمیان اٹک گئی فرار کی کوئی راہ مجھے نظر نہیں آتی تھی پھر رندھے ہوئے گلے سے میں نے اسے اول تا آخر ساری کہانی سنا دی وہ سنجیدگی اور ہمدردی سے

میری بات سنتا رہا دوران گفتگو اس نے صرف دو مرتبہ مجھے ٹوک کر خود پر قابو پانے کی تلقین کی اور اس بات کا احساس دلایا کہ ہم "پبلک پلیس" پر بیٹھے ہیں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں نہیں۔

میری المناک کہانی کے اختتام پر اس نے کہا۔

"نجمہ! اپنے آنسو پونچھ لو" اس نے اپنا رومال میری طرف بڑھایا۔ پھر اسے تہہ کر کے کمال محبت سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"یہ رومال مجھے ہمیشہ تمہاری بے وقوفی کی یاد دلاتا رہے گا"۔ وہ مسکرایا

"نجمہ! شاید تم اس بات کو جھوٹ سمجھو کہ مجھے ان تمام حالات اور واقعات کا علم تھا۔ تم تو بخوبی جانتی ہو ہمارے اندرون شہر محلوں میں لوگ صرف دوسروں کے عیب پر نظر رکھتے اور دوسروں کی کھوج لگانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس کافی فالتو وقت اس دلچسپ مشغلے کی نذر کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ تمہاری امی کا خاندان وہاں پچھلے بیس برس سے قیام پذیر ہے اور ان کے افسانے محلے گلی کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ تمہارے گھر میں روزانہ عجیب عجیب اور بے ہودہ قسم کے لوگوں کی آمد اور تمہاری والدہ اور بہن کے نت نئے فیشن، غیر ملکی اشیاء کی بھرمار اور تمہارے والد کی گھرکی، یہ سب کچھ سب کی نظروں میں شروع سے تھا اور ہے۔ ایک تمہارے والدین کو یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ لوگ اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔

جب انہیں احساس ہوا کہ ان کی سوچ غلط ہے لوگ ان کے کرتوت سے آگاہ ہونے لگے ہیں تو انہوں نے مکان بدلنے ہی میں عافیت جانی تمہارا ذاتی کردار کیا ہے؟۔ تمہارے متعلق میں اور فرزانہ کیا سوچتے ہیں؟ تم شاید اس کا تصور بھی نہ کر پاؤ تم رتن جوت کا وہ پھول ہو جو گندگی کے ڈھیر پر پرورش پا رہا ہے۔ گلاب کی مہک کو موت نہیں آتی۔ اس کی خوشبو یہاں وہاں ہر جگہ زندہ رہتی ہے تمہاری طرح تمہارے کردار کی طرح۔ تمہاری پاکیزگی کی قسم میں ہی نہیں ہمارے محلے کا ہر بچہ کھا سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک گزرنے لگتا ہے کہ تم واقعی ان لوگوں کی اولاد ہو۔

"نجمہ!" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں یہ سب کچھ جاننے کے بعد دل و جان سے اپنایا ہے۔ میری محبت میں اتنی ہی سچائی ہے جتنی سورج کے کل صبح طلوع اور غروب ہونے میں ہے۔ مجھے علم تھا تم کسی روز مجھے اپنے دکھوں میں حصہ دار بناؤ گی۔ آج جب تم نے مجھے یہ کہانی سنائی ہے تو مجھے تم پر ہی نہیں خود پر بھی فخر ہونے لگا ہے کہ تم نے مجھے اس قابل جانا۔ نجمہ! یہ تو ممکن ہے کہ دنیا بھر کے سمندر خشک ہو جائیں، سورج کی روشنیاں اندھی پڑ جائیں۔ چاند ہمیشہ کے لئے گہنا جائے۔ سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ مجھے موت آ جائے میرا وجود مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے، لیکن یہ کبھی ممکن نہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت کوئی وسوسہ کوئی وہم میرے دل سے تمہیں، تمہاری محبت کو کبھی نکال پائے گا"۔

آصف بولتا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے تپتے وجود پر آہستہ آہستہ ٹھنڈی شبنم گر رہی ہو۔ تراوٹ، تازگی اور ٹھنڈک کا لطیف احساس میری رگ رگ میں سرایت کر رہا تھا۔ میں بے خود ہوتی جا رہی تھی۔

"نجمہ! میں نہیں جانتا تمہارے اس فعل کا محرک کونسا جذبہ ہے؟۔ شاید عورت کا فطری انتقام تمہارے لاشعور میں پرورش پانے لگا ہے یا کچھ اور بہر حال میں تمہیں کسی ایسے فعل سے منع نہیں کروں گا جو بظاہر تمہارے یا میرے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ صرف ایک درخواست کروں گا کہ اگر یہ سب کچھ کسی منصوبے کا حصہ ہے تو اس سے دست بردار ہو جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف یہ یاد رکھو کہ تم آصف کے لئے بنی ہو اور تمہیں ڈاکٹر بن کر دنیا کو دکھانا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی پریشانیاں ہیں، جتنے دکھ ہیں وہ سب میری جھولی میں ڈال دو۔ جن سے محبت کی جائے ان کے سامنے نہ اپنے کسی عمل پر شرمندگی کا اظہار کیا جاتا ہے نہ ہی ان سے اپنے دکھ سکھ علیحدہ کئے جاتے ہیں"۔

اس نے میرے ہاتھوں کو دونوں ہاتھوں میں سہلاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے آصف نے کبھی مجھے اس طرح چھوا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس، لہجے کی مٹھاس، ارادوں کی پختگی اور باتوں میں چھپے لامتزلزل جذبے نے مجھے دوسرے جہانوں میں پہنچا دیا۔

بے خودی کا عالم تب ٹوٹا جب ہمیں کیبن کے قریب ویٹر کے قدموں کی شریفانہ چاپ سنائی دی۔ بل ادا کرنے کے بعد جب ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اتنا ہلکا پھلکا کہ مجھے اپنا وجود فضا میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

(۳)

گھر پہنچی تو وہی ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو جاری تھی۔

"زہراں! ایک در بند تو سو در کھلے۔ بے فکر رہ۔ ایک پرائیویٹ فرم میں چکر چلا رہا ہوں۔ اگر چل گیا تو یہ سمجھ کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ سارے دھونے دھو ڈالوں گا"۔ والد کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

آج پہلی مرتبہ انہیں گھر پر میں نے شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک برچھی سی میرے کلیجے میں اتر آئی۔ خود سے باندھے سارے پیمان ٹوٹتے دکھائی دیئے۔ کمرے میں والد صاحب کے دو تین دوست بھی اسی ماکھے شاہ کے ساتھ موجود تھے۔

ڈرائنگ روم میں تو یہ ہنگامہ جاری تھا اور میرے کمرے میں امی اور ان کی ایک نوجوان سہیلی "اپنے منگیتر" سمیت براجمان تھے۔ میرا خون ہی تو کھول اٹھا۔ امی نے ہمارے گھر کو طوائف کا کوٹھا بنا ڈالا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی اس گھر میں "غیرت" کا وجود بہر حال باقی تھا۔

میری شکل میں ... ان کی اپنی اولاد کی شکل میں!!

"کیا بے ہودگی پھیلا رکھی ہے یہاں" میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"آنٹی" اور اس کے دوستوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ امی کے لئے یہ بالکل غیر متوقع اور اچانک بات تھی۔ انہیں تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

"کیا بک رہی ہے"۔ انہوں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"میں کہتی ہوں ایسی ذلیل حرکتوں کے لئے کیا میرا کمرہ ہی رہ گیا ہے۔ اور کیا مر گئے ہیں سب لوگ" میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر جا۔ حرام کی جنی۔ ابھی تیری خبر لیتی ہوں"۔ امی کے تیور خطرناک تھے۔

انہوں نے چاہا کہ اٹھ کر مجھے ماریں لیکن ان کی نوجوان سہیلی اور دوست بیچ میں آ گئے۔

"جانے دیجئے آنٹی! کوئی بات نہیں۔ پھر کیا ہوا؟ لڑکی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آنٹی۔ فار گاڈ سیک۔ ہماری وجہ سے مت جھگڑا کیجئے"۔ اس کے "منگیتر" نے جو شکل سے مخنث زیادہ اور مرد کم نظر آ رہا تھا پھنسی پھنسی آواز نکالی۔

"تیری یہ مجال ... میں تجھے ..." امی نے دونوں کے درمیان سے نکلتے ہوئے میری طرف بڑھنا چاہا لیکن عابدہ دوسرے کمرے سے بھاگتی ہوئی آئی اور ان سے لپٹ گئی۔

"امی خدا کے لئے" ... اس نے اپنی فاحشہ ماں کے پیروں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں ہی نہیں امی بھی پگھل کر رہ گئی اور ان کے دوست امی کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ مجھے علم تھا کہ شراب کے نشے میں دھت باپ کو کانوں کان اس حادثے کی خبر نہیں ہوئی ہوگی۔

ان لوگوں کے وہاں سے دفع ہوتے ہی میں نڈھال سی ہو کر اپنے بستر پر جا گری۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے خود میں عجیب و غریب تبدیلی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر کوئی بہت مضبوط نجمہ آ کر چپکے سے بیٹھ گئی ہے جسے کسی کی پرواہ نہیں۔ کسی کا خوف نہیں ...!! نہ ہی مجھے اپنے اس عمل پر کوئی شرمندگی کا احساس ہوا۔ اپنے اندر موجود اس جرأت کا انکشاف مجھ پر پہلی مرتبہ ہوا۔

صرف پندرہ روزہ ٹریننگ کا ثمر ہے یہ؟ یا نفرت کے پکتے ہوئے لاوے نے اپنی راہ پالی ہے؟ یہ دونوں ہی خیالات بیک وقت مجھے آئے۔ کچھ بھی تھا یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ مجھ میں کچھ تبدیلی تو رونما ہوئی ہے اور یہ بڑی کامیابی تھی میرے لئے؟۔

عابدہ فوراً واپس آئی تھی۔ بے چاری کمزور سی لڑکی "باجی" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے خود سے الگ کیا۔

"عابدہ! رونے سے زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو"۔

میرا لہجہ بھلے کتنا ہی نرم سہی لیکن اس میں چھپے طنز کو عابدہ نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

"میں کیا کروں باجی! ہم کیا کر سکتے ہیں"۔ وہ تڑپ کر بولی

"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں عابدہ! صرف ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ تم حوصلہ رکھو"۔

"باجی! میں آپ کی طرح بہادر نہیں ہوں"۔ اس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میری طرح بہادر بننا ہوگا عابدہ! ورنہ کسی روز ..." میں نے ایک ایک لفظ چبا کر اور خاصے غصیلے لہجے میں عابدہ سے کہا۔

"خدا کے لئے باجی!" اس نے میرے منہ کی بات چھین لی۔

"تم عقل مند ہو عابدہ! اپنا راستہ خود متعین کر لو۔ میں شروع ہی سے ماں باپ کے کہنے میں نہیں ہوں تم جانتی ہو۔ دنیا کا کوئی مذہب کوئی ضابطہ اخلاق 'انسانیت کی کوئی شق' اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ماں باپ کے کہنے پر برائی کا راستہ اختیار کر لیں نہ ہی کوئی ہم سے یہ بہانہ سننے پر تیار ہو گا کہ ہم مجبور تھے۔ یہ دنیا مجبوروں اور بے کسوں کے لئے نہیں۔ لوگ تو برائی کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔ ہم کیا نیکی کو زندہ رکھنے کے لئے وقتی قربانی نہیں دے سکتے"۔

میرے لیکچر نے اس کے آنسو سکھا دیئے تھے۔ وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اٹھ کر باہر جا رہی تھی تو میں نے محسوس کیا جیسے ابھی نیکی اس کے اندر زندہ ہے میں نے کہا نا کہ نیکی کو موت نہیں۔ سچائی امر ہے۔

○

کھانا عابدہ میرے لئے کمرے ہی میں لے آئی رات تک کسی نے میرے کمرے میں آنے کی ہمت نہ کی۔ رات گئے ابو میرے کمرے میں آئے۔ اس وقت وہ مکمل ہوش و حواس میں تھے۔ شاید اسی لئے میں نے انہیں خوش آمدید کہا ورنہ میرے تیور اس روز کچھ زیادہ ہی خطرناک تھے بالکل اسی فوجی کمانڈر کی طرح جو آنکھیں بند کر کے دشمن کی صفوں کے اندر ہی اندر گھستا چلا جائے یہ سوچے جانے بغیر کہ اس کے گرد اگرد گھیرا بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کی پشت بھی غیر محفوظ ہے۔

میں اس وقت مطالعہ کر رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہے میری پڑھاکو بیٹی؟" ابو نے اندر آ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کالج کا کام کر رہی ہوں ابو!" میں نے ان سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ میرے لہجے میں چھپی بغاوت کی بُو ان کے ہوشیار ذہن تک پہنچ گئی تھی۔

"ارے کیا بیٹھنے کو بھی نہ کہو گی۔ بھئی ایسی ناراضگی بھی کیا" انہوں نے خود ہی کرسی کھینچ کر میرے قریب کر لی۔

"نہیں ابو!" میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ آخر وہ میرا باپ تھا۔

"دیکھو بیٹی! اگر ہم نے تمہاری طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور تم کالج میں پڑھ رہی ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم گستاخ بھی ہوتی جاؤ"۔ گرگ جہاندیدہ نے پسلاہی ہوا ریڈ کا یاں کیا تھا۔

"آپ کا شکریہ ابو! کہ آپ مجھے تعلیم دلوا رہے ہیں لیکن میں نے کبھی گستاخی کا تصور بھی نہیں کیا"۔ میں نے ڈھال سامنے کر دی۔

"شاباش! اپنی ماں کو جنم دینے والی ماں کو اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دے رہی ہو اور گستاخی کس

چیز کا نام ہے؟"۔

"ابو! اس مسئلے کو نہ ہی چھیڑیئے تو بہتر ہو گا"۔ میں نے موضوع بدلا۔ "یعنی تمہیں یہ تک نہ پوچھوں کہ تم نے اپنی ماں کو ذلیل کیوں کیا تھا ؟" "واہ بھئی واہ۔ کچھ زیادہ ہی تعلیم یافتہ ہو رہی ہو آجکل"۔ ان کے طنز کی کاٹ بظاہر تو گہری تھی یہ الگ بات کہ چکنے گھڑے سے پھسلنے کے علاوہ اور کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

"ابو! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے زبان کھولنے پر مجبور نہ کیجئے"۔ میرے اندر پہلا ابال اٹھا۔

ابو نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میری بات کو وہ پا گئے اور فوراً سنبھالا بھی دے دیا۔

"دیکھو بیٹی! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ نجانے کس گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اب اگر تم بھی مجھے دکھ دینے لگیں تو کسی روز میں منہ ہی نہ کالا کر جاؤں"۔ انہوں نے اولاد کی کمزور رگ کو بڑی چابکدستی سے دبایا۔

"ابو! خدا کے لئے ایسا مت سوچئے۔ امی نے ..... "میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ابو نے ہاتھ بڑھا کر میری بات کاٹ دی۔

"مجھے اور کچھ نہیں سننا۔ میں جانتا ہوں تم کچھ زیادہ ہی عقل مند ہو گئی ہو۔ اتنی عقل مند کہ تمہیں اپنی ماں بھی طوائف نظر آنے لگی ہے۔ دیکھو بیٹے جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہمارا کوئی بیٹا تو ہے نہیں کہ جو کچھ ہم کما رہے ہیں وہ اس کے نام لگ جائے گا۔ یہ جو کچھ ہم کرتے ہیں صرف اور صرف تمہاری بھلائی کے لئے تم تصور کرو کہ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کو آج کے زمانے میں کوئی منہ لگانے کے لئے بھی تیار ہے کیا؟ جب تک ہم نئے تقاضے نہیں اپنائیں گے کوئی تمہاری قابلیت اور سلیقہ شعاری پر لعنت بھی نہیں بھیجے گا۔ لوگ رشتہ کرنے سے پہلے اس کا وزن کرتے ہیں۔ اس کی اوقات کو حالات کے ترازو میں تولتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں بڑا کھلا کمپیٹیشن ہے بیٹی! تم لاکھ پڑھ لکھ جاؤ کبھی اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تمہارے تایا کی بیٹیوں میں یہ گیرے پڑے ہیں۔ کیا کمی ہے ان کے کردار میں گاؤں میں رہتے ہیں وہ لوگ۔ اس کے باوجود کسی نے آج تک رشتے کو نہیں پوچھا۔ جانتی ہو کیوں؟ نہ ان کی بیٹیوں کو نئے زمانے کے آداب آتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس دینے کو بے تحاشہ دولت رکھی ہے۔ بیٹی! تم لاکھ لائق فائق سہی لیکن ابھی اتنی عقل مند بھی نہیں ہو کہ ہمارے اعمال کا محاسبہ کرنے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری کوئی دلیل سننے کو تیار نہیں ہوں۔ تم صرف ایک بات یاد رکھو کہ تم نے اپنی ماں کی بے عزتی کی ہے اس کے مہمانوں کے سامنے۔ جاؤ اور اس سے فوراً معافی مانگو"۔

انہوں نے بولا آخر اپنا فیصلہ بھی بڑی ہوشیاری سے سنا دیا۔

یہ معاملہ صرف میرے باپ ہی کا نہیں دنیا بھر کے اس قماش کے سارے باپوں کا تھا۔ اگر یہاں نیاز محمد کے بجائے کوئی خیرات علی یا نذر حسین بھی ہوتا تو کیا کچھ کہتا۔ اتنی بودی اور گھسی پٹی دلیل کا پوسٹمارٹم کرتے انہوں نے

بظاہر اپنی بات کو بڑا مدلل اور وزنی بنا کر پیش کیا تھا' لیکن اس گفتگو کے پس پردہ کیا ذہنیت کار فرما تھی اس کا اندازہ مجھے خوب تھا۔

"تمہارے ماں باپ کافر بھی ہوں تمہارے لئے ولیوں کا درجہ رکھتے ہیں"۔ میرے لاشعور میں سوئی دادی اماں نے انگڑائی لی۔ اپنے اندر ابلتے جذبات کا گلا گھونٹ کر میں محض وقتی جان چھڑاؤ پالیسی پا کر "دیکھو اور انتظار کرو" کا نظریہ اپنا کر اٹھی اور والد کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔

میرا رخ امی کے بیڈ روم کی طرف تھا۔

اگلی صبح جب میں کالج گئی تو مارشل آرٹس کی کلاس میں میرا جوش و خروش دیدنی تھا۔ خدا جانے مجھے یہاں پہنچتے ہی کیا ہو جاتا تھا' یوں لگتا جیسے مجھے چند روز بعد کسی زبردست مقابلے میں حصہ لینا ہے اور خوب تیاری کرنی ہے۔

"آپ بہت جلد کسی قابل ہو جائیں گی بی بی"۔ تجنی اماؤں والی شکل کے انسٹرکٹر نے میرے پسینے میں بھیگے جسم کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کی۔ لوگ پہلے پہل بڑے ذوق شوق سے اس طرف آتے ہیں پھر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ مشقت سے ڈرتے ہیں بے چارے۔ مس نجمہ! بندے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ محنت سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اسے سب کچھ بیٹھے بٹھائے ہی مل جائے"۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ یہاں کچھ پانے کے لئے بھی جی جان سے محنت کرنا پڑتی ہے اور دیکھنے نا مس! مزا بھی اسی شکار کا آتا ہے جو بڑی جدوجہد کے بعد ہاتھ لگے۔ شکاری کو جنگل کی کانٹے دار جھاڑیوں میں دوڑاتا پھرے' دلدلوں میں پھنسائے' پانیوں اور کیچڑ میں گھسیٹتا پھرے"۔

"سر! میرا یہ سٹیپ ٹھیک اٹھتا ہے نا" میں اس کے مکمنہ طویل لیکچر سے نجات پانے کے لئے ہمیشہ ایسے ملتا جلتا کوئی فقرہ کہہ کر اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کروا دیتی"۔

آصف کی مصروفیات اب کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ سول انجینئرنگ میں داخلہ لے لینا ہی بہادری نہیں تھی' اب اس منہ میں آئی کو زچ کرنی کو نکلنا بھی ایک کام تھا۔ وہ دن رات پڑھتا' محنت کرتا' اپنے شاندار مستقبل کے لئے لیکن اس نے ملاقات کا مقدس فریضہ کبھی نہ بھلایا۔

مہینے میں ایک دو مرتبہ وہ ضرور مجھ سے ملتا۔ مجھے نصیحتیں کرتا' محبت کی باتیں کرتا۔ زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنے کو کہتا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جو کچھ مجھے آصف کہہ رہا ہے وہ اصل میں میرے باپ کو مجھ سے کہنا چاہئے تھا۔

اور کبھی کبھی یہ احساس گزرتا کہ وہ جس قرینے' جس سلیقے سے زندگی بسر کرنے کا سبق دے رہا ہے اصل میں یہ میری ماں کا فرض تھا کہ مجھ سے ایسی باتیں کرتی۔ اس کی محبت پوری کائنات پر محیط تھی۔ وہ سائبان تھا جس کے تلے میں زندگی کی کڑکتی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے آن بیٹھتی تھی۔ اس نے ہمدردی سے دکھ سے محبت سے مجھے کبھی سیدھے راستے سے نہ ہٹنے دیا۔

زندگی کے جس منہ زور کف اڑاتے گھوڑے پر میں سوار تھی۔ اس کی باگیں عملاً میں نے آصف کو تھما دی تھیں۔ آصف بڑا منجھا ہوا سائیس تھا۔ وہ دوڑ کی اور عام چال کا فرق بخوبی جانتا تھا۔ اس نے کبھی اس منہ زور گھوڑے کو غلط قدم نہ اٹھانے دیا۔ ہوٹلوں میں باغات کے کسی محفوظ کنج میں۔ دریا کی لہروں پر ہلکورے لیتی کشتی میں کبھی بھی کسی بھی جگہ اس نے اپنا فرض نہ بھلایا کبھی اس نے کوئی چوک نہ کی۔

اپنے پائنچے اونچے کئے ننگے پاؤں ساحل پر بچھی دریا کی ریت نما مٹی میں ہم دونوں اپنے قدموں کے نشان چھوڑتے بھاگتے چلے جاتے۔ ہمارے سانس پھولنے لگتے۔ سینوں کا زیر و بم ایک دوسرے پر بجلیاں گرانے کو لپکتا لیکن اس نے کبھی اپنے وجدان کی باگیں ول کو نہ تھمائیں۔ اس کی آنکھوں میں کبھی شہوت کی سرخیاں نہ لہرائیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اس کے ٹھنڈے رویئے سے الجھن ہونے لگتی۔

میرا جی چاہتا آصف مجھے دوڑ کر بازوؤں میں بھر لے اور ہم ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں دھڑکنے لگیں۔ اس کے قرب سے میری نسیں ٹوٹنے لگتیں"۔ لیکن وہ شانت رہتا سمندر کی طرح جس کے اندر طوفان چکراتے ہوں لیکن جو باہر سے مکمل پرسکون رہے۔

اس ندی کی طرح جو صدیوں سے اپنے سینے میں جانی انجانی کہانیاں چھپائے اپنے نئے اور پرانے پانیوں کے ساتھ چپ چاپ بہتی چلی جائے۔ جب کبھی میرے اندر کوئی بے نام سی خواہش انگڑائیاں لے کر مجھے توڑنے لگتی' وہ مہاتما بدھ بن کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا۔

میں گھر کی تلخیوں سے فرار چاہتی تو اس کی محبت کے برگد کی شہنیوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتی۔ زیادہ محنت کرنے سے ایک نازک سی عینک اس کی ناک پر جم گئی تھی۔ جب کبھی وہ مجھے پریشان پاتا تو بدھ بھکشوؤں کی طرح پہلے عینک کے شیشوں کو رومال سے صاف کر کے ناک پر جماتا پھر اپنے ذہن کی پوتھی سے کوئی ایسا قاعدہ' ایسا کلیہ' ایسا فلسفہ' ایسی منطق باہر نکالتا کہ میں ششدر رہ جاتی۔

محبت کے وہ سارے لوازمات ہم نے پورے کئے جن کی تکمیل دنیا بھر کے عاشقوں کے لئے ضروری ہے۔

ہم نے پتھروں پر دل تراشے' درختوں کی چھاتیوں میں اپنے نام کے تیر گاڑے' دریا کے ریتیلے ساحل پر لکھ لکھ کر مٹایا اور مٹا مٹا کر لکھا۔ یوکلپٹس کے تاریک جھنڈ میں گیلی مٹی اور گرتے پتوں کے ملاپ سے اٹھنے والی خوشبوؤں کو اپنے اندر سمویا۔ پائن کے درخت تلے گرمیوں کی دوپہروں میں گھاس پر آلتی پالتی مار کر

کوک کی بوتلیں پئیں۔ سرخ اور پیلے گلابوں کی خوشبوئیں محسوس کیں۔ آموں کے بور پر کوئلوں کی کوکو سنی۔ سولسری کی کلیاں بکھر کر زمین پر سفید رنگ کی چادر بچھتے دیکھی۔ گیندے کی باس، [illegible] کے شگوفے سب سے حظ اٹھایا۔ اپنی پسند کے ریکارڈ ایک دوسرے کو سنائے۔

لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ وقت کی چال بہت گہری ہوتی ہے۔ سارے پتے ہاتھ میں پکڑ کر بھی انسان بازی ہار دیتا ہے۔ زندگی صرف مستقبل کا نام نہیں ایک [illegible] کا قانون موسیقی کی دنیا میں کہیں رائج نہیں۔ وقت کا گیت مدھ، مندر اور تار۔ تینوں سپتکوں میں گانا پڑتا ہے۔ یہاں پہلے اور دوسرے کالے سے نہیں، پہلی "پنچم" سے نہیں ہر سر سے ہر تال سے راگ پھوٹتے ہیں۔ یہ تیرا اور [illegible] کی دنیا ہے۔ اس کی وادی اور سم وادی کو جانے بغیر اس میں قدم رکھنا سانپ کی بانبی میں منہ دینے کے مترادف ہے۔ میں نے اپنے دل کے نمالچے پر محبت کی وینس کو اس وقت لوریاں دلائیں جب میرے آئس کریم کھانے اور ٹیبل ٹینس کھیلنے کے دن تھے۔

میں نے آصف کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر شاید اس زہرناک حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ محبت کے کھدی کھڈے میں ہمیشہ چھکا ہی نہیں لگا کرتا کبھی چاروں "کانے" بھی گرتے ہیں۔

تانبے کے کشتے کو کھرل کرنے کے لئے بڑا لمبا سنیاس بھگتنا ہوتا ہے۔ بڑے جنگلوں کی خاک چھاننی ہوتی ہے۔ لوہا یونہی میگنٹ نہیں بن جاتا۔ بڑے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اس کو خراوی سان پر چڑھنے کے بعد ہی دھات کوئی شکل اختیار کرتی ہے۔

محبت کوئی کھیل نہیں، لوڈو کی بازی نہیں کہ مقابل کو دھوکہ دے کر گوٹیاں آگے پیچھے کر لی جائیں۔ یہ شطرنج کی ایسی بازی ہے جسے جیتنے والا ہار تا اور ہارنے والا جیت جاتا ہے۔

جب میں اپنے "حال" کی طرف دیکھتی تو اس بات پر جھوم کر رہ جاتی کہ وقت نے سارے رنگ کے پتے میری جھولی میں ڈال دیئے ہیں لیکن اس بات کا کبھی گمان بھی نہ گزرا کہ ترپ چال تقدیر ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ آدمی بظاہر بڑے [illegible] سے "تینوں بادشاہوں" کے بل بوتے پر گیم شروع کرتا ہے لیکن اچانک غلام کا اکا اسے منہ کے بل گرا دیتا ہے۔

حالات کا بننا، بگڑنا، بنانا، بگاڑنا کچھ بھی تو انسان کے بس میں نہیں صرف سوچیں اپنی ہیں، خیالات اپنے ہیں۔ بس سوچتے جاؤ، مستقبل کے سنہرے سپنے بنتے جاؤ اور ایک روز سب کچھ خاموشی سے اپنی موت مر جاتا ہے۔

شاید یہی ہوتا ہے وہ لمحہ جب باشعور انسان پاگل ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کے پاس اپنا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ نہ اپنی سوچ نہ کوئی منصوبہ بندی نہ کوئی راستہ نہ کوئی منزل

○

اس روز جب کمپنی باغ کے ایک محفوظ گوشے میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے آصف نے ابو کے تبادلے اور اپنے وظیفہ پا کر غیر ملک جانے کا اعلان کیا تو جیسے سب الوژن ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ ہمارے دونوں اطراف میں اپنی مترنم، متوازن اور پرسکون آواز میں گنگناتے جھرنوں کو موت آ گئی۔ چشمے کے کنارے لگے سنگ مرمر کے خوبصورت بنچے نیچے گرے اور ٹوٹ گئے۔ فضاؤں کے سارے حسن کو زہریلے پھنکارتے ناگ نے ڈس لیا۔ میرے گرد اگرد اکی خوبصورت پھولوں کی بیلوں نے اژدھوں کا روپ دھار کر مجھ پر آگ برسانی شروع کر دی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے دسمبر کے سورج کی کرنوں نے شبنم کو چوس کر گھاس میں چنگاریاں دوڑا دی ہوں۔ چائے کا گھونٹ تیزاب بن کر میرے حلق سے گزرتا جسم کی تمام وریدوں اور رگوں میں گردش کرنے لگا۔ میرے بدن میں انگاروں کا رقص شروع ہو گیا۔ میری حالت اس مریض کی سی ہو گئی جو کلوروفارم سونگھنے کے فوراً بعد آپریشن ٹیبل سے اٹھ کر بھاگ آیا ہو۔ میری کنپٹیاں شائیں شائیں کرنے لگیں۔ سب کچھ گڈمڈ ہونے لگا۔

بظاہر میں سب کچھ دیکھ رہی تھی، محسوس کر رہی تھی، بول رہی تھی، لیکن حقیقتاً میری تمام حسیات کو موت آ چکی تھی۔ کلیجہ خون ہو رہا تھا۔ زبان کا ذائقہ بدل چکا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے آصف کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی ہو رہی تھی۔ آج تک اس کی آنکھیں میں نے اس طرح نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ رخصت ہو چکی تھی۔

اس کی عینک کے شیشے دھندلا گئے۔ ہمیشہ کی طرح اس نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا۔ اس سے اپنی عینک کے شیشے اور گیلی آنکھیں پونچھیں اور رومال میری طرف بڑھا دیا۔

"آنسوؤں کا ذائقہ تو کچھ خاص نہ ہو گا، لیکن آنسو مرتے نہیں۔ یہ منجمد ہو کر انسان کے اندر ہمیشہ جمے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک رومال سے تمہارے آنسو پونچھے تھے۔ تم یہ رومال رکھ لو جس طرح وہ رومال میں نے رکھ لیا ہے۔ محبت بڑی عجیب شے ہے یہ اچھے بھلے سنجیدہ اور سمجھدار بندے کو بسا اوقات بچہ بنا دیتی ہے۔ نجمہ! میں آج خود کو تمہارے سامنے بچہ محسوس کر رہا ہوں۔ آج تک میں تمہاری انگلی تھام کر تمہیں چلاتا آیا ہوں۔ آج تم تھوڑی دیر کے لئے آصف بن جاؤ"۔ اس نے کسی گہرے کنوئیں میں بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا۔

میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ اتنی سینہ کوبی کروں کہ کلیجہ شق ہو جائے۔ اپنے آنسوؤں میں ساری کائنات کو بہا دوں، لیکن کسی نے میرے اندر بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا۔

"یہ خود غرضی ہے نجمہ! تیرا محبوب بڑا آدمی بننے باہر جا رہا ہے۔ قسمت نے اسے زندگی میں آگے بڑھنے کا موقعہ دیا ہے۔ اس کی محنتوں کے درخت پر بڑی لمبی تپسیا کے بعد ثمر لگا ہے۔ اب کیا تو بزدلوں کی طرح اس کے

سامنے رو کر اس کے ارادوں کو متزلزل کرنا چاہتی ہے۔ تم کیا یہ چاہتی ہو کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر نہ جائے یا اگر بادل نخواستہ جائے بھی تو ایک پھانس اس کے سینے میں اٹکی رہے۔ اس کا دھیان تعلیم سے ہٹ کر تمہاری طرف لگا رہے۔ نہیں..... نہیں..... یہ خود غرضی ہوگی یہ بہت بڑا ظلم ہوگا اس کے ساتھ..... پگلی سنبھل جا..... آنسوؤں کا گلا گھونٹ دے۔ سینے سے اٹھتی ہوک کو سینے ہی میں دفن کر لے..... قربانی دے..... قربانی کر..... ذبح ہو جا..... اپنے ارمانوں کو اپنی تمناؤں کو محبت کی بھینٹ چڑھا دے..... مسکرا..... مسکرا کر دیکھ اس کی طرف..... اس کا حوصلہ بڑھا..... "..... !

اور میں مسکرا دی.....!

آنسوؤں سے بھیگی اس مسکراہٹ نے آصف کو بھی رلا دیا۔ اس نے آج پہلی مرتبہ بے اختیار مجھے آگے بڑھ کر سینے سے چمٹا لیا۔

"نجمہ! میں تمہیں اپنی دھڑکنوں میں اپنے سانسوں میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ دو سال ہی کی تو بات ہے۔ تم میڈیکل میں پڑھ رہی ہوگی اور میں انجینئر بن کر لوٹوں گا..... کیسا شاندار لگے گا وہ سب کچھ..... یہ تصور ہی کتنا خوشگوار ہے نجمہ"۔

اس نے میرے کانپتے وجود کو بڑی آہستگی سے تھپتھپا کر خود سے الگ کیا اور ہم ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئے۔

○

میرے ایف ایس سی کے امتحانات میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ ساری رات میں اپنا تکیہ آنسوؤں سے بھگوتی رہی۔ فرزانہ بھی تو یہاں سے جا رہی تھی۔ کوئی بھی دھکو سلا باقی نہیں بچا تھا میرے لئے کیسی کرموں جلی تھی میں..... کیسے بھاگ تھے میرے یوں بھی کوئی اتنا ہے جیسی میں بیچ چوراہے کے لٹی تھی۔

صبح کالج گئی تو کلاس روم کے باہر ہی تجنی لاماؤں کی شکل والا انسٹرکٹر لڑکیوں کے گھیرے میں کھڑا تھا۔

"مس نجمہ!" اس نے مجھے دیکھتے ہی خوشی کے ملے جلے تاثرات سے پکارا "کل آپ گرین بیلٹ کے لئے فائٹ لڑ رہی ہیں۔"

"سر!" میں نے ٹوٹتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "میں معافی چاہتی ہوں۔ اب میں کورس اٹینڈ نہ کر سکوں گی"۔

"پاگل ہو گئی ہے لڑکی" فرخندہ نے مجھے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم واحد لڑکی ہو جو اس کالج سے گرین بیلٹ کے لئے فائٹ لڑ رہی ہے۔"

"میں نے آہستگی سے اپنی سہیلی کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف کیا اور اپنے کلاس روم میں داخل ہو گئی جہاں اردو کی مسز خان بڑی سوز مندی سے غالب کا یہ شعر سنا رہی تھیں۔

دیتا نہ اگر دل تمہیں لیتا کوئی دن چین ○ کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

کالج میں دو تین پیریڈ بعد ہی میں اٹھ کر گھر چلی آئی۔

پانچویں روز آصف کی روانگی تھی۔ ہم شام گئے تک ایک دوسرے کو طفل تسلیاں دیتے رہے۔ پھر وہ رخصت ہو گیا۔

"مجھے ضروری کاغذات کی تیاری کے لئے اسلام آباد جانا ہے۔ وہیں سے میری فلائٹ بھی ہے۔ ہمیں اب رخصت ہونا ہے بجنہ!" اس کی آواز بڑی گمبھیر تھی۔

یہ مراجعت کا لمحہ تھا۔

یہ زندگی کی جلتی چتا میں کود پڑنے کا وقت تھا.....!

مجھے زندگی سے رخصت لے کر وقت کی کالی دیوی کے حضور حیات کا بلیدان پیش کرنا تھا۔

میرے اندر کی ساری چتائیں ٹوٹنے لگی تھی۔ آنسوؤں کا تیز دھارا اب کچھ بہا کر لے جانے کو آیا تھا۔

اس لمحے مجھے تجنی لاماؤں کی شکل والے انسٹرکٹر کا پہلا سبق شدت سے یاد آ گیا..... روکو..... حملے کو روکو..... اپنے جسم پر اپنی جان پر..... تھکا دو..... تھکا کر مار دو..... مس نجمہ! جسے مار کھانے کا فن نہیں آتا وہ کبھی اچھا فائیٹر نہیں بن سکتا۔ چوٹ لگنے پر تکلیف تو بہت ہوتی ہے لیکن جیت کے نشے میں سب کچھ بہہ جاتا ہے.....!

میں نے اپنی زخمی نظریں اٹھائیں۔ اس کے سراپے کو جی بھر کر دیکھا جانے اب کے بچھڑے پھر کب ملیں۔ یہ غنیمت لمحے بڑے جانگسل تھے لیکن ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں اس کے سینے سے جا لگی۔ اس روز زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ آصف نے اپنے تپتے ہونٹ میری پلکوں پر رکھ دیئے۔

"میں یہ روشنیاں اپنے ساتھ لے جاؤں گا نجمہ.....!" وہ آج دوسری طرح کا مرد نظر آ رہا تھا۔

دم رخصت وہ مجھے رکشا میں گھر تک چھوڑنے آیا۔ پھر ہاتھ ہلاتا رخصت ہو گیا۔ میں شکستہ دل، نڈھال وجود، لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی جہاں فرزانہ اور اس کی دوسری بہن میرا انتظار کر رہی تھیں۔

پرانے محلے سے رخصتی کے وقت اس نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس پر آخری وقت تک عمل پیرا رہی۔

"باجی! آپ کو علم تو ہو گیا ہوگا۔" اس نے میرے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے یہی جانا تھا کہ میرے آنسو اب خشک ہو چکے ہیں، لیکن وہ سوتے پھر پھوٹ نکلے۔ میں اس سے لپٹی آنسو بہاتی رہی۔

"آپ بہت یاد آئیں گی باجی! میں آپ کو روزانہ خط لکھا کروں گی۔ اللہ وہ دن جلدی لائے باجی! جب آپ دلہن بن کر ہمارے ہاں آ جائیں۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

مجھے حوصلہ مند رہنے کی تلقین کر کے دونوں بہنیں بھی رخصت ہو گئیں۔ یہ بڑا جان لیوا صدمہ تھا۔ پہلے پہل تو خود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس جانکاہ حادثے سے سنبھل پاؤں گی لیکن آہستہ آہستہ حواس بحال ہونے لگے۔ فرزانہ نے جاتے ہی خط لکھا تھا۔ پھر آصف کا خط آگیا جو اس نے اسلام آباد سے رخصت کے وقت لکھا تھا۔ اس کے بعد وہ جس ائرپورٹ پر رکا مجھے خط لکھتا گیا۔ اس نے ہر خط میں اپنی محبت کی شدت کا یقین دلایا تھا۔ مجھے نارمل رہنے کی استدعا کی تھی اور کہا تھا۔ یہ سب بھول کر ساری توجہ امتحانات پر دوں کیونکہ ایف۔ ایس۔ سی کے رزلٹ پر ہی سارے کیریئر کا دارومدار تھا۔

○

والدہ نے تو اپنے بچپن نہ بدلے میں نے البتہ "در گذر" کی پالیسی اپنائی اور اپنی آنکھیں جیسے حالات سے بالکل ہی بند کر لیں لیکن اس واقعہ کے بعد کسی کو میرے کمرے میں گھس کر کوئی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ امی نے تو ایک طرح سے میرا مقاطعہ کر رکھا تھا۔ مہینوں ہم ماں بیٹی میں بمشکل چند باتیں ہی ہو پاتی تھیں۔ عابدہ نے پہلے پہل تو میری بات مانی لیکن جس طرح سے وہ والدہ کے رنگ میں رنگی جا چکی تھی وہاں سے اس کی واپسی خاصی مشکل نظر آ رہی تھی۔

مالکے شاہ نے اپنے اثر و رسوخ سے والد صاحب کو اس مقدمے سے بری کروا لیا تھا لیکن ان کے محکمے نے دوبارہ انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر والد نے الگ مقدمہ اپنے محکمے کے نام دائر کر رکھا تھا۔

اس دوران ایک پرائیویٹ فرم ان کے ہتھے چڑھ گئی جہاں پر چند روز بعد ہی ان کے جوہر کھلنے لگے۔ انہوں نے اپنے کہنے کے مطابق واقعی "دھونے دھوڈالے" تھے۔ رخصت بہاریں لوٹ آئیں۔ امی کو دن رات جوان رہنے کی فکر کھائے جاتی تھی۔ مالکے شاہ کی آمد روفت بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اپنی معتقد عورتوں کا ایک حلقہ یہاں میری ماں کی مدد سے بنا لیا تھا۔ یہ سب ذہنی فاحشائیں تھیں جو اپنی نسوانیت کا خون کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

امی کی شہرت اب یہاں بھی ہونے لگی تھی اور محلے کے آوارہ منش نوجوانوں کی میلی نظریں اب میرا طواف بھی کرنے لگی تھیں۔ اس برے وقت کے لئے میں نے مارشل آرٹس میں کچھ شد بد پیدا کی تھی۔ دو ماہ میں پانچ شریف زادے مجھ سے اچھی بھلی ٹھکائی کروا چکے تھے۔ جس کے بعد سے جہاں محلے کے لفنگے مجھ سے خوفزدہ رہنے لگے وہاں امی اور ابو کے "دوستوں" کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ "نجمہ جوڈو کراٹے بھی جانتی ہے"۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کسی نے میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کی۔ میں بھی خود کو گھر سے الگ تھلگ کسی دوسری دنیا کی مخلوق جاننے لگی تھی۔

○

ایف۔ ایس۔ سی کے امتحانات شروع ہو گئے۔ ابھی میرے آدھے پرچے ہی ہوئے تھے کہ ایک روز رات

کے وقت تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔

"پولیس ابو کو گرفتار کرنے آئی ہے۔" عابدہ نے میرے کان میں سہمی سہمی سرگوشی کی۔

"ہیں!" میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔

ہم دونوں بہنیں ہی خوف سے لرزاں برآمدے تک آئیں۔ ابو کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی تھیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔ امی نے حسب روایت یہاں بھی اپنے غمزہ و ادا سے تھانے دار کو بہلانا چاہا لیکن منہ کی کھائی۔

"عقل کر مائی! کیا تیرا بھی ساتھ ہی جانے کا پروگرام ہے۔" نوجوان اے۔ ایس۔ آئی نے جس کا فراخ اور چمکدار ماتھا اس کے "اصلی" اور "طلائی" ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا امی کو ڈانٹ پلائی۔

"میں نمٹ لوں گی تم سب سے۔" امی اپنی اوقات پر اتر آئیں۔

اس کی اس بات کا جواب ایک خجستہ صورت حوالدار نے پولیس کی مصفّٰی و مسجّٰی زبان میں ایسا دیا کہ پھر امی کو بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"گھر کا خیال رکھنا میں ذرا شاہ صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔"

انہوں نے ہمیں متنبہ کیا اور اس کے فوراً بعد ہی گھر سے نکل گئیں۔ پولیس کی زبانی علم ہوا کہ جس کمپنی میں والد صاحب کام کرتے تھے وہاں کا ایک آدمی کسی دوسرے شہر میں چوری کا مال بیچتے ہوئے گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ شخص ابو کا کارندہ تھا۔ اس نے پولیس کا ایک جوتا کھائے بغیر ہی سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور اب ابو کو چوری اور غبن کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ الزامات کی نوعیت خاصی سخت تھی اور بچ نکلنے کے امکانات بھی کم نظر آ رہے تھے۔

ساری رات گھر میں ہم دونوں بہنیں اور ایک بوڑھا ملازم ڈرے سہمے اپنے اپنے کمروں میں دبکے رہے۔ مجھے افسوس تو بے حد ہوا لیکن دکھ بالکل نہیں ہوا تھا۔ آخر کب تک بکرے کی ماں خیر مناتی۔ ابو اور امی کا تو یہ ایمان بن چکا تھا کہ پیسے کے زور سے سب کو گرایا اور جھکایا جا سکتا ہے لیکن آج انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ معاملہ اس کے الٹ بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتا ہے۔

اس کے باوجود بھی امی اس خبیث شاہ کے پاس اپنے جوہر آزمانے چلی گئی تھی۔ علی الصباح جب مؤذن نے خدا کی حمد و ثنا کے ساتھ سب کو نماز پڑھنے کی تلقین کی تو میں بے اختیار خدا کے حضور جھک گئی۔ میں نے گڑگڑاتے ہوئے التجا کی کہ مولا میرے والدین کو گناہوں کی اس دلدل سے باہر نکال دے انہیں انسان - اشرف المخلوقات بنا دے

شاید دعاؤں کے مستجاب ہونے کا بھی کوئی مخصوص وقت ہوتا ہو گا اور مجھے کبھی ان خاص لمحات کا ادراک

نصیب نہ ہوا۔ امی کی واپسی ماکھے شاہ کے ساتھ ہوئی۔ دونوں سیدھے ڈرائنگ روم میں جا گھسے۔

"ہمارے لئے چائے بنالاؤ" انہوں نے مجھے حکم دیا جو میں نے حسب عادت عابدہ کو منتقل کر دیا۔

"زہراں! دیکھ لیا ہم سے الگ رہ کر کام کرنے کا نتیجہ۔ اب بھگتنے دو اسے اکیلا۔" شاہ کی آواز بلند ہوئی۔

میں کمرے کی کھڑکی سے کان لگائے کھڑی تھی۔

"شاہ جی! اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ معاف کر دیں۔" ماں کی آواز سنائی دی۔

"زہراں! تیری خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ ماکھے شاہ یاری لگانا ہی نبھانا بھی جانتا ہے۔ ویسے میری مان تو اسے رہنے دے دو چار ماہ جیل میں۔ خوامخواہ کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے۔ تجھے ہمارے ہوتے ہوئے کمی آخر کس بات کی ہے۔"

اس کی مکروہ آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسانے لگی۔

"شاہ جی! سمجھا کرو۔ دنیاداری بھی آخر کسی چیز کا نام ہے۔" ماں کی آواز نے میرے کانوں میں زہر گھولا۔

مجھ میں مزید خباثت انگیز گفتگو سننے کی تاب باقی نہیں رہی تھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور اپنے بستر پر گر اپنی بدبختی کا ماتم کرنے لگی۔

○

آصف کی جدائی' والد کی گرفتاری' ماں کی بے راہروی' ان سب باتوں نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ کتاب کھولتی تو لفظ گڈمڈ ہو کر رہ جاتے۔ ان کی شکلیں بگڑنے لگتیں اور عجیب عجیب مکروہ چہرے اس میں سے جھانکنے لگتے۔ وسوسوں کے پھنکارتے ناگ اپنے پھن کاڑھے میرے گرد اگرد بیٹھے رہے۔ میں ہر روز ایک نئے کرب سے آشنائی حاصل کرنے لگی۔ ان حالات میں حوصلے اور امید کا پیغام فرزانہ اور آصف کے وہ دو چار خطوط تھے جو بعد میں میرا سرمایہ حیات بنے۔ لیکن لفظوں کے سہارے امیدوں کے آسرے پر زندگی نہیں گزرتی۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ہاتھ کی باندھی گانٹھیں دانتوں سے کھولنی پڑتی ہیں۔

جو لوگ میری طرح یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبانے سے طوفان کا خطرہ ٹل جائے گا۔ وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ عملی زندگی کا سچ بڑا کثیف اور کڑوا ہوتا ہے۔

اس کسیلے اور زہریلے ذائقے کا احساس انہی زبانوں کو ہوتا ہے جنہوں نے اس سے آشنائی بہم پہنچائی ہو۔ دنیا میں کوئی سائنسدان سمندر کے کنارے بیٹھ کر اس کے اندر جنم لیتے طوفانوں کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔

میں نے اپنی دانست میں یہ جان لیا تھا کہ بس دو سال ہی کی تو بات ہے۔ یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے لیکن یہ دو سال دو صدیوں پر محیط ہو رہے تھے۔ حالات کی گرفت میرے گرد مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی تھی۔ تقدیر نے جو تانا بانا مجھ پر بُن دیا تھا اس مکڑی کے جالے میں لاکھ ہاتھ پاؤں مارتی پر کبھی کمزور مکھی کی طرح باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

جیسے تیسے کر کے میرے امتحانات بھی ختم ہو گئے تو وقت گزاری کا اور کوئی شغل باقی نہ رہا۔ اب میری تمام تر امیدیں اپنے رزلٹ سے وابستہ تھیں۔ ان سارے گورکھ دھندوں کے باوجود میرے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے اور مجھے اپنی محنت اور خدا کی ذات سے کلی امید تھی کہ میرے نمبر بہت شاندار آئیں گے۔

اس دوران بظاہر میں گھر کے معاملات سے لاتعلق بنی رہی تھی لیکن مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ ابو لمبی جیل یاترا پر چلے گئے۔ امی کے لچھن وہی تھے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اب ان کی سوشل سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ ماکھے شاہ کے کرتوت دیکھ کر میرا خون کھولتا تھا لیکن میں بہت کچھ ہوتے کچھ نہ کر سکتی تھی۔ میری حالت ان مظلوم طوائف زادیوں جیسی تھی جن کے لئے فرار کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ جو بہت کچھ کر گزرنے کی ہمت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کر پاتیں۔

رزلٹ نکلنے سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے شاید امی اور عابدہ والد سے جیل ملاقات کرنے گئے تھے۔ میں گھر میں اکیلی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ماکھے شاہ ایک رکشے سے اتر کر اندر آ رہا تھا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے"۔

میں نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اسے بے رخی سے جواب دے کر واپس جانے کو کہا لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ ماکھے شاہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے احتیاطاً اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ میں تو خود اس موقع کی منتظر تھی کہ کوئی بہانہ ہاتھ آئے اور اس موذی کو کوئی سبق سکھاؤں۔

"سنا نہیں"۔ میں نے کہا "گھر کوئی نہیں ہے"۔ میں نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

"ہم کوئی باہر کے تو نہیں ہیں۔ گھر والے ہیں۔"

وہ اب میرے بالکل نزدیک آ چکا تھا اور اس کے منہ سے اٹھتے شراب کے بھبکے مجھ تک پہنچنے لگے تھے۔ گویا ماکھے شاہ پورا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ اسے یقیناً علم ہو گا کہ گھر پر میں اکیلی ہوں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہوس جس طرف پینیں مارنے لگی تھی اس کا اندازہ تو مجھے تھا لیکن اس کی اتنی ہمت۔ یہ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔

"میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے"۔

اس مرتبہ مجھے خود اپنا لہجہ اجنبی لگ رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔

ماکھے شاہ کو شراب کے نشے میں سوائے میری جوانی کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے شاید ان باتوں کو

بھی میری ادا جانا اور برآمدے میں پہنچ کر اپنی شہوت بھری آنکھوں سے گھورتے ہوئے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس نے مجھے زہراں کی بیٹی ہی سمجھا تھا۔

تمام بھولے ہوئے سبق مجھے یاد آ گئے۔ میں نے پاؤں میں پہنے سینڈل کی ایڑی اس زور سے اس کی پنڈلی پر ماری کہ وہ درد سے بلبلانے لگا اور آگے کی سمت جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری گھومتی ہوئی لات اس کی پسلی میں لگی اور وہ برآمدے کی دیوار سے جا ٹکرایا..... ! دو ضربوں نے ہی اس کا نشہ ہرن کر دیا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ یقیناً بہت غیر متوقع اور اچانک تھا۔

حیرت تکلیف اور غصے کے ملے جلے تاثرات لئے وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا لیکن میں اسے سنبھلنے کی مہلت ہی دینا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس سے اتنی شدید نفرت تھی کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا گوارا نہیں کیا۔ میری دونوں ٹانگوں میں بجلیاں بھر گئیں اور باری باری وہ ماکھے شاہ کی پسلیاں بجانے لگیں۔

دوسرے تیسرے وار ہی میں وہ برآمدے سے لڑھک کر نیچے جا گرا خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

"بیٹی..... بیٹی! رک رک۔ کیا کر رہی ہو"۔ اس نے گھگھیاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"نکل جاؤ۔ ورنہ تمہارا خون پی جاؤں گی"۔

میں نے دھاڑتے ہوئے کہا

وہ "اچھا اچھا جاتا ہوں" کہتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

ماکھے شاہ کی پٹائی کرنے کے بعد میں خاصا روحانی سکون محسوس کرنے لگی تھی۔ یوں لگا جیسے جسم کے بند بند کو مزا آ رہا ہو۔ ڈرائنگ روم میں آ کر میں نے ٹیپ کا سوئچ آن کر دیا اور صوفے سے ٹیک لگا کر گانا سننے لگی۔

امی اور عابدہ کی آمد تھوڑی دیر بعد ہی ہو گئی۔

"شاہ جی تو نہیں آئے تھے ادھر"۔ امی نے آتے ہی بے چینی سے دریافت کیا۔

"آیا تھا"۔ میں نے سکون سے جواب دیا۔

"پھر"؟

"میں نے باہر نکال دیا"۔

"کیوں؟" امی حیران۔

"اس لئے امی کہ وہ کسی نیک ارادے سے یہاں نہیں آیا تھا"۔ میں نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"تیرا خانہ خراب ہو۔ ان سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی"۔ امی نے پوچھتے ہوئے کہا۔

"صرف دو چار ٹانگیں جمائی ہیں زیادہ نہیں۔ اس سے زیادہ کی اس میں ہمت بھی نہیں تھی"۔ میں نے

اس طرح کہا جیسے کسی میچ کا تذکرہ کر رہی ہوں۔

"اری ناخلف! کرموں جلی! تیرا ستیاناس ہو۔ تو نے سید کی ذات پر ہاتھ اٹھایا۔ تیرے ہاتھ نہ ٹوٹ گئے۔ اب تیرے باپ کو کون چھڑائے گا جیل سے۔ کون پالے گا تمہیں تیرے باپ کے مربعوں سے پیسے آئیں گے کیا زندگی گزارنے کے لئے"۔ انہوں نے مجھے بددعائیں دینی شروع کر دیں۔

میں نے اٹھ کر ٹیپ کا سوئچ آف کر دیا۔

"امی! مجھے بدتمیزی پر آمادہ نہ کریں۔ میری طرف سے سارا گھر مر جائے۔ اگر کسی نے میری طرف میلی نظر سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھیں نکال دوں گی۔ خواہ وہ آپ ہی کیوں نہ ہوں"۔ میرا لہجہ اتنا خوفناک تھا کہ عابدہ تو سہم کر رہ گئی۔

امی بولتے بولتے رک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ انہیں شاید یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان کی مخاطب میں ہوں۔ نجمہ! ان کی بیٹی۔ چند لمحات تک وہ بے بسی اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے گھورتی رہی۔ پھر پاؤں پٹختی وہاں سے باہر آ گئی۔ امی کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ مجھ سے انہوں نے کبھی یہ توقع تو نہیں رکھی تھی کہ میں کسی قسم کی بیہودگی برداشت کروں گی یا کبھی ان کے نظریات کم از کم عابدہ کی حد تک اپناؤں گی لیکن میری طرف سے اتنے جارحانہ رویے اور کھل کر مقابلے پر اتر آنے کی امید بھی انہیں نہیں تھی۔

میرا یہ روپ ان کے لئے شاید اجنبی نہ ہونے کے باوجود چونکا دینے والا تھا ان کی دانست میں کچھ بھی ہو' آخر میری اوقات تھی ہی کیا؟ ایک کالج میں پڑھنے والی' ماں باپ کی محتاج بے کس سی لڑکی جو زیادہ سے زیادہ زبانی کلامی باتوں سے دل کی بھڑاس نکال سکتی تھی۔

یہ کہ میں مردوں کی طرح ہاتھ پاؤں بھی چلا سکتی ہوں ان کے لئے بالکل نئی' انوکھی بات تھی۔ حالانکہ میری اس سلسلے میں شہرت ان تک پہنچ بھی چکی تھی۔ لیکن انہوں نے شاید اس بات پر یقین ہی نہیں کیا تھا

○

صبح بے چینی سے میں نے اخبار میں اپنا رزلٹ دیکھا۔ میری اعلیٰ نمبروں سے فسٹ ڈویژن آئی تھی۔ سب سے پہلے میں نے آصف کو یہ خوشخبری امریکہ پہنچائی اور فوراً میڈیکل کالج میں داخلے کیلئے درخواست دے دی۔

ایک ہفتہ بعد جب میں اپنا رزلٹ دیکھنے گئی۔ تو یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری کہ میں دس نمبروں کی کمی سے میرٹ لسٹ میں آنے سے رہ گئی ہوں۔ یہ بڑا اندوہناک حادثہ تھا۔

○

بڑی جان لیوا خبر تھی..... ! میرے لئے ساری ریاضتیں اکارت گئیں۔ دس نمبروں سے میں زندگی کی لڑائی ہار گئی۔

تو یہ تھا میرا انعام ..... میری پاکیزگی 'محنت' 'شرافت کا یہ شرملا تھا مجھے کہ دس نمبروں سے مجھے اعلیٰ تعلیم سے محروم کر دیا گیا۔

میری تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ خواب یوں بھی چکنا چور ہوتے ہیں۔ یہ تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

آج سوچتی ہوں میری زندگی تباہ کرنے میں اس ظالم تعلیمی نظام کا کتنا زبردست عمل دخل ہے اگر میرے شاندار تعلیمی ریکارڈ کے پیش نظر تعلیمی پالیسیاں بنانے والے جھوٹے ناخدا مجھ پر رحم کر لیتے' میری آہ زاری پر کان دھر کر مجھے دس نمبروں کی رعایت سے مشروط طور ہی پر سہی میڈیکل میں داخلہ مل جاتا تو زندگی کبھی منفی راہیں نہ اختیار کرتی۔ شاید یہ تیرہ بختیاں میرا مقدر نہ بنتیں۔ آخر مجھ سے سو سو کم نمبر والوں کو بھی تو کونے کی سیٹوں پر داخلہ ملا تھا۔

میں نے کس کس کی منت نہیں کی۔!

کس کس کو درخواست نہیں دی۔!

کہاں کہاں اپنی بے بسی اور غربت کا واسطہ نہیں دیا۔

کون سے در پر جھولی نہیں پھیلائی میں نے۔!

محکمہ تعلیم کے ہر بڑے افسر کی چوکھٹ پر آنسو بہائے۔ رو رو کر فریاد کی۔ بین السطور میں اپنے گھریلو حالات کا احساس دلایا۔

لیکن کوئی دل نہ پگھلا۔ میرے لئے کسی نے آنسو نہ بہایا ..... کسی کو میری حالت پر رحم نہ آیا۔ ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔

"بی بی! ہم مجبور ہیں ....."

"یہ قانونی معاملہ ہے"۔

"اس میں ہمارا گناہ نہیں"۔

جب میں نے ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی جن کے نمبر مجھ سے کم تھے اور انہیں داخلہ مل گیا تھا تو کہا گیا۔

"وہ تو فلاں کے کوٹے میں سے ملا ہے"۔

زندگی سے میں نے چوکھی لڑائی لڑی اور ہار گئی۔

سوائے آصف کے اس دنیا میں اور کون تھا جو میرے دکھ درد کو محسوس کرتا۔ رزلٹ کے کچھ ہی روز بعد اس کا جوابی ٹیلی گرام آیا۔ اس نے میری شاندار کامیابی پر مبارکباد دینے کے بعد لکھا تھا کہ ٹیلی گرام بھیجنے کے ہفتہ بعد وہ فلاں فون نمبر پر جو اس کے ایک رشتہ دار کے گھر لگا ہوا تھا مجھ سے بات کرے گا۔

یہ مبارکباد مجھے اس وقت ملی تھی جب مقامی اور ملک کے دوسرے میڈیکل کالجوں کی میرٹ لسٹ میں میں آنے سے رہ گئی تھی جس روز میں آصف سے فون پر بات کرنے اس کے عزیز دوست کے گھر پہنچی ارباب بست وکشاد کی طرف سے بھی مایوس ہو چکی تھی اور ناکام انسانوں کی طرح اب اس معجزے کی امید لگائے بیٹھی تھی۔ جیسے کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتا تھا۔

میری حالت تب اس وقت سزائے موت کے اس مجرم جیسی تھی جس کے بلیک وارنٹ سائن ہو چکے تھے۔ تمام اپیلیں رد ہو چکی تھی۔ رحم کی درخواستوں کو جواب مل گیا تھا لیکن جو موت کے تختے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بھی اس بات کی امید رکھتا ہے کہ کوئی انسانی کوئی معجزہ ابھی کسی بھی لمحے 'کسی بھی پل رونما ہو کر اسے بچا لے گا۔

○

دوپہر کے بعد فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے غیر ملکی کال کا مژدہ سنایا۔ اس کا دوست مجھے فون تھما کر خود باہر نکل گیا۔

"ہیلو۔ مجھ کیسی ہو"۔ اس کی نجباط میں ڈوبی آواز ہوا کے دوش پر سفر کرتی میری سماعت کو جھنجوڑ رہی تھی۔

"آصف!" میرے لفظ سسکیاں بن گئے۔

"ارے بیوقوف پانچ منٹ کی مہلت نصیب ہوئی ہے۔ یہ گھڑیاں کیا رو کر بتانے کی ہوتی ہیں"۔ اس نے بظاہر مذاق میں بات ٹالنا چاہی لیکن اس کی دلی کیفیت کیا تھی اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتی تھی۔

"مجھے کہیں داخلہ نہیں مل رہا۔ کہیں نہیں"۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔

"کیوں؟"

"میرٹ لسٹ میں آنے والوں کے نمبر مجھ سے زیادہ ہیں اور کوٹے کی سیٹیں اس سے بھی زیادہ"۔ میں نے روہانسی ہو کر کہا

"ارے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ پھر تیاری کرو۔ اگلے سیشن میں داخلہ بھیجو۔ چھ ماہ ہی کا وقفہ تو ہے اور چھ ماہ چٹکی بجاتے گزر جائیں گے"۔ اس نے گلا پھاڑ کر تسلی دی۔

"آصف مجھ سے نہیں ہو گا۔ نہیں ہو گا۔ بس اب میں ہار چکی ہوں"۔

میرے آنسو تھے کہ بہے چلے آتے تھے۔

"اچھا بھئی۔ ٹھیک ہے بی اے کر لو۔ بی ایس سی کر لو۔ جیسی تمہاری مرضی مجھے تم ہر صورت قبول ہو لیکن خدا کے لئے رونا دھونا چھوڑ دو۔ اور ہاں کوئی بیٹ وغیرہ بھی ملی ہے یا بس یوں ہی"۔ اس نے میرا موڈ بدلنے کے لئے مقدور بھر کوشش کی۔

ہزاروں میل کی دوری پر بھی اس نے اپنے فرض کو بھلایا نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ میری مسیحائی کر رہا تھا۔ اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر بھی وہ مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اوہ آصف۔ کتنے عظیم تھے تم۔ ؟

" آصف..... میں..... میں..... " میرے منہ سے الفاظ بمشکل ہی نکل پائے تھے جب لائن کٹ گئی۔

" مائم ختم ہو گیا جناب۔ " مقامی آپریٹر مخاطب تھا۔ میں نے ٹوٹے بازو سے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

جیلر نے ملاقات کا وقت ختم ہونے کی منادی کر دی تھی اور موت کی راہ کے مسافر کی الوداعی ملاقات ہو چکی تھی۔

پھر اس کے بعد فلک نے یوں کبھی اس سے ملنے نہ دیا۔ خوشیوں کے لمحات اپنا بستر سمیٹ کر رخصت ہو گئے۔ بس میرے مقدر کے حصے کی خوشیاں اتنی ہی تھیں۔ یہ بھی شاید کسی اور کا حصہ ہو گا جو کاتب تقدیر نے میری طرف نجانے کیوں منتقل کر دیا تھا۔ شاید قدرت کا یہی دستور ہے کہ وہ انسان کی بے بسی کا خوب خوب تماشہ کرنے کے بعد ہی اسے بھیانک انجام سے دوچار کرتی ہے یا شاید یہ مجھ ناکام کی سوچ ہے۔

" بیٹھیے۔ میں آپ کے لئے چائے لاتا ہوں۔ " آصف کے دوست نے مجھے باہر نکلتے دیکھ کر مخاطب کیا۔

اس کے دوست بھی اس کی طرح اونچے آدرشوں کے مالک عظیم انسان تھے۔ اتنے عظیم انسان جن کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی کہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی سکھ تو حاصل ہو جائے۔

" شکریہ بھیا۔ میں چلتی ہوں۔ " میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

" بہن جی! اس گھر کو اپنا گھر ہی جانئے۔ میں آصف کا کلاس فیلو ہوں۔ جب کبھی دل چاہے تشریف لائیے۔ اپنے دوست کے کسی عزیز کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہو گی " ۔

اس نے نظریں جھکائے جھکائے میری طرف دیکھے بغیر مجھے مخاطب کیا۔

" شکریہ بھائی! میں نے گھمبیر آواز میں کہا اور اس کی اگلی بات سنے بغیر تیزی سے باہر نکل آئی۔

مجھے یوں دکھائی پڑتا تھا کہ اگر یہاں تھوڑی دیر کے لئے اور رک گئی تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گی۔

گھر پہنچی تو نڈھال ہو چکی تھی۔

میرے اعصاب منتشر ہو رہے تھے۔

آصف کے ساتھ ناکملی گفتگو نے مجھے ڈبو دیا تھا۔

خدایا زندگی میں ہر بات کا " وقت " ہمارے " وقت " سے پہلے ہی کیوں ختم ہو جاتا ہے۔

گھر کے حالات آہستہ آہستہ بدل رہے تھے۔ ماکھے شاہ سے ناراضگی مول لے کر ہم بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ بھی شاید امی سے اب جان چھڑانے کے چکر میں کسی بہانے کی تلاش میں تھا کیونکہ امی کا دم خم اب ٹوٹ

رہا تھا۔

سرخی پاؤڈر کی لیپا پوتی تھی سے ماکھے شاہ جیسے خبیث لوگ متاثر نہیں ہوتے کیونکہ امی سے اس کے تعلقات کی جو نوعیت تھی وہ ایک خاص حد تک ایک خاص مدت تک ہی چل سکتی تھی۔ اب خود امی نے اسے اپنے جیسی کئی " زہرہ جمالوں " سے متعارف کروا دیا تھا اور ماکھے شاہ نے کہ ایسے معاملات پر خوب دسترس رکھتا تھا تعارف کو تعلقات اور پھر مراسم کی منزل تک لے جانے میں بڑی عجلت دکھائی تھی۔ وہ میدان حرص و ہوس کا پرانا اور منجھا ہوا شہسوار تھا۔ عورت کی خصوصاً درمیانے طبقے کی ان عورتوں کو دو راتوں رات امیر ہونے کے خواب دیکھ رہی ہوں شیشے میں اتارنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔

اس کی زندگی اسی کھیل میں گزری تھی۔ وہ بڑی مکاری سے بڑی خباثت کے ساتھ اپنے متعارف کی کمزور نبض ڈھونڈتا اور اسے دبا کر اپنے گھناؤنے مقاصد کے لئے بروئے کار لے آتا۔ بہت کم ایسی خوش قسمت عورتیں تھیں جو اس کے پھیلائے دام تزویر سے بچی ہوں۔

زہراں کی بیٹی کے ہاتھوں اس کی درگت تو ایک بہانہ تھا۔ جب سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب نیاز محمد کے بچنے کے امکانات فنی فنی بھی نہیں رہے اور گلچھرے اڑانے کے چانسز بھی ختم ہو چلے تو اس نے امی سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا کیونکہ صرف جسمانی مراسم تو اس کے زہراں جیسی نجانے کتنی عورتوں سے تھے۔ اسے کچھ اور بھی چاہئے تھا۔ حرام کی کمائی میں سے اپنا حصہ۔ روزانہ نئے نئے لوازمات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیا اور تازہ خون۔ ماکھے شاہ کا پتا کٹانا تو امی کو کسی اور ماکھے شاہ کی تلاش ہوئی لیکن کھونے اور پانے کے درمیان کا وقفہ خاصا لمبا ہوتا جا رہا تھا کیونکہ ایسی عورتوں کو فصلی بیٹرے تو مل جاتے ہیں مستقل یاری پالنے والے نہیں ملتے۔ اس درمیانی وقفے میں امی نے نہ تو اپنا " سٹینڈرڈ آف لونگ " بدا تھا نہ ہی ان کے پھیپھڑے بدلے۔

والد صاحب کو " اچھی جیل کٹانے " پر معمولی خرچ نہیں اٹھتا تھا۔ جیل سے متعلقہ حکام کی تمام جائز ناجائز فرمائشیں پوری کرنی ہوتی تھیں جس کے لئے بہر حال سرمایہ درکار تھا۔

اب نوبت یہ آ چلی تھی کہ امی نے جمع پونجی خرچ کرنی شروع کر دی تھی اور وہ سرمایہ بھی جو انہوں نے والد کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان سے چھپا کر الگ سے محفوظ رکھا ہوا تھا استعمال میں لانا شروع کر دیا تھا کیونکہ والد کے مقدمے عدالت کچہری پر تو جو خرچ اٹھ رہا تھا وہ اٹھ ہی رہا تھا خود امی کا ذاتی خرچ بھی نوابوں کی بیگمات سے کم نہ تھا۔

نئے سے نئے میک اپ کا سامان کپڑے ساڑھیاں خوشبویات اور دیگر الم غلم ان کا ذاتی آرائش و زیبائش کا بل کسی فلم کی ہیروئن سے کم کیا ہو گا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں آصف مجھے اگلے سیشن میں داخلہ لینے یا مزید تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دے رہا

تھا۔

ساری رات یہی سوچ سوچ کر میری نسیں ٹوٹتی رہیں کہ میں اس کی توقعات پر پوری اتروں تو کیونکر؟ اور اگر پوری نہ اتروں تو کیا اس کی محبت برقرار رہ سکے گی جانے اس کے لوٹ کر جانے کے باوجود ابھی تک میں اس خوف کو اپنے ذہن سے کیوں نہ نکال پائی تھی۔ زندگی کا مشت روپ میں نے آصف کے علاوہ دیکھا ہی کہاں تھا۔ منفی رویوں نے مجھے یوں اپنے شکنجے میں جکڑا تھا کہ میرے اندر کا خوف کبھی مر ہی نہ سکا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بزدل بنی رہی۔

ڈھلتی عمر کی طوائفوں کا سرمایہ حیات عموماً ان کی جوان چھوکریاں ہوتی ہیں۔ امی نے کھل کر کبھی اپنے طوائف ہونے کا اقرار نہیں کیا نہ ہی انہوں نے کوئی کوٹھا سجایا لیکن ان کے پیشہ "مہذب طبقے کی طوائف زادیوں" سے کم بھی نہ تھے اور ہمارا گھر بھی ہمیشہ ہی "کوٹھی خانہ" بنا رہا۔

اس لحاظ سے وہ بدقسمت رہیں کہ اپنی متاع حیات کو اپنے راستے پر نہ چلا سکیں کیونکہ معاملہ مجھ سے شروع ہوتا تھا۔ جب میں ہی ان کے جال میں نہ پھنسی تو عابدہ کیسے پھنستی؟ اس حد تک تو عابدہ ان کے ساتھ تھی کہ وہ اسے شمع انجمن بنائے رکھیں لیکن یہ نہیں کہ وہ کسی خلوت گاہ کو وہ روشن کرے میں نے کبھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ نرمی سے ڈانٹ سے محبت سے ہر طرح میں نے اس کے لاشعور میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ مشرقی لڑکی کا واحد سرمایہ اس کی پاکیزگی اور کنوارہ پن ہے۔ اگر یہی نہ رہے تو وہ کوڑیوں کے مول بک جاتی ہے۔

میری تربیت تھی خدا کا فضل تھا کہ اس نے ماں کے ساتھ گھومنے پھرنے یا یاریاں اڑانے سے تجاوز نہ کیا اور ایسے گھناؤنے اور بیہودہ ماحول میں بھی اپنا دامن عصمت بچا کر رکھا۔

دستور زمانہ کے مطابق امی کی نظریں بھی اب ہماری ہی طرف اٹھیں لیکن میں نے تو "جارحیت" کی حد تک اور عابدہ نے زبانی کلامی ان کی بین السطور میں کی گئی ایسی کسی بات کا بھی فوراً منہ توڑ جواب دیا۔ وہ ہم سے اتنی امید ضرور رکھتی تھیں کہ ہم ان کی سربراہی میں کم از کم نوجوانوں کو بے وقوف تو بنا لیا کریں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس حد تک بھی جانے کو تیار نہیں تھا۔

ان حالات میں امی سے تعاون کی امید عبث دکھائی دیتی تھی اور وہی ہوا۔

صبح جب میں نے ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ اور تمہاری ڈاکٹری بھی۔ ساری زندگی کا ٹھیکہ میں نے نہیں لے رکھا۔ گھر کا کام بیچ بیچ کر تمہارے اللہ تلے پورے کر رہی ہوں۔ اب ماں کو بیچ دو گی۔ اری تو تو دوبارہ واٹھے کا کہتی

ہے۔ میرے پاس تیری مزید تعلیم کے لئے پھوٹی کوڑی نہیں میری طرف سے جہاں جی چاہے جا۔ منہ کالا کر"۔

تھوڑی دیر تک سانس لینے کو وہ رکیں۔

"لڑکی! میں کہے دیتی ہوں۔ نوکری کر لے کہیں۔ اپنا اور بہن کا پیٹ پال۔ میرے پاس تمہارے باپ کے خرچوں سے کچھ بچے گا تو دوں گی یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ غور سے سن لے۔ تو بڑی حاجن بنی پھرتی ہے' تو اپنی ذمہ داری پوری کر۔ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے کہ تمہیں اور جمیں سنبھالے گا۔ کما کر لا اور ہمیں بھی کھلا"۔

اتنا کہہ پیر پٹختی وہ گھر سے چلی گئیں۔

(۴)

زندگی کے تمام فیصلے ٹھنڈے دل و دماغ سے شاید اس لئے بھی نہیں کئے جاتے کہ آدمی خود نہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ کیونکہ انتظار خواہ فیصلے ہی کا ہو بڑا جان لیوا بن جاتا ہے۔ انسانی سانسوں میں کچھ ایسے منہ زور سر پھرے اور لاابالی لمحے بھی آتے ہیں جن میں صدیوں کی قوت بند ہوتی ہے۔ ان لمحوں میں آدمی جو سوچتا ہے، کہتا ہے، انجام سے بالکل لاپرواہ ہو کر ماحول سے اطراف سے بالکل بے گانہ ہو کر گزرتا ہے۔

یہ بڑے عجیب و غریب فیصلے ہوتے ہیں۔ یا تو آدمی فضاؤں میں اڑنے لگتا ہے یا پھر تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں بھی اسے پناہ نصیب نہیں ہوتی اور وہ ناکامیوں اور ذلالتوں کے آخری مدارج کو چھونے لگتا ہے۔

وہ بھی شاید ایسا ہی کوئی لمحہ ہو گا جب میں نے ماں کے چیلنج کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور خود سے کہا۔

"نجمہ بیگم تم ڈاکٹری اور آصف کے لئے نہیں بنیں۔ تمہاری قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا ہے اور خیریت اسی میں ہے کہ نصیب کے لکھے پر صاد کرو کہ تمہاری بغاوت ان آسمانی فیصلوں پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں ہو سکتی"۔

تین دن تک سوچ بچار کرنے کے بعد بالآخر ایک روز جھنجھلا کر میں نے ایک اخبار میں چھپے اشتہار کے مطابق نرسنگ میں داخلہ لے لیا ...!

میں نصیبوں جلی۔ ڈاکٹر بننے چلی تھی اور نرس بن گئی ...!!

میرے ایف ایس سی کے نمبر، مطالعہ، قدرت، جسمانی صحت، علمیت کس کس کو کہاں کہاں رو دیا جاتا فوراً داخلہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں گھر سے ہوسٹل پہنچ گئی جہاں بدنیتیاں، سیاہ کاریاں اپنا بھیانک جبڑا کھولے نجانے کب سے بانہیں پھیلائے میری منتظر تھیں۔ سب مجھ سے یوں ملیں جیسے صدیوں کے بچھڑے ایک دوسرے کو ملا کرتے ہیں۔

تضادات کی جس صلیب پر حالات نے مجھے ٹکا دیا تھا وہاں مجھے یہ گیان ضرور حاصل ہو گیا کہ زندگی کے وہ انگور جو سوبار اچھلنے کودنے پر ہمارے ہاتھ نہیں آتے اگر ہمارے منہ میں آ بھی جائیں تو ان کا ذائقہ نہیں بدل سکتا۔ وہ کھٹے ہی رہتے ہیں کہ تقدیر ہر حال کبھی نہ مرنے والی چھپکلی کی طرح زندہ ہے۔

میرے اعزازات، درجہ اول کی سندیں، اسکول و کالج کے انعامات کوئی مدارج نہیں تھے کہ میں ان کو پھلانگتی منزل تک جا پہنچوں۔ یہ سب کچھ تو منزلوں کے سراب تھے۔ آصف کی محبت جو مجھے ملی تھی، یونہی نہیں مل گئی تھی۔ اس کی تلاش میں میں نے بڑی آبلہ پائی کی تھی۔ بڑی صحرانوردی کی تھی، بڑی تیز دھے میز دھے، الجھے ہوئے پیچیدار اور نوکدار پتھروں والے راستوں پر ننگے پاؤں گھومی تھی۔ اگر سال دو سال کو مجھے راستے کے کسی موڑ پر، صحرا کے کسی نخلستان میں آصف کی رفاقت میسر آ ہی گئی تھی تو اس کی حیثیت اس نخلستان سے زیادہ ہرگز نہ تھی جہاں پل بھر کو یا گھنٹہ دو گھنٹے یا دو چار روز تک ستا کر راہرو سانس لیا کرتے ہیں۔ زندگی کے صحرائے اعظم میں بھٹکتے ہوئے اگر کہیں کوئی کنواں پھوٹ ہی پڑے، پتھریلی زمین سے اگر پانی نکل ہی آئے تو اس کی حیثیت کو دائمی مان لینا بے وقوفی ہوتی ہے۔

یہ کنویں کچھ وقت کے بعد خود بخود خشک ہو جاتے ہیں ... کہ یہی قانون قدرت ہے۔

اور نجمہ نے اس پر صاد کیا ... لبیک کہا ... آمنا صدقنا کی صدا دی ...!

میں نے سوچا میں آصف کے قابل نہیں ہوں محبت صرف اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا نام نہیں پھیلا ہوا ہاتھ نہیں کہ گزرنے والے اس پر خیرات کی اٹھنیاں، چونیاں رکھتے گزر جائیں چاہے جانے کی آرزو رکھنا الگ چیز ہے اور چاہنا بالکل الگ شے ... میں نامطلوبی کی صرصر کب تک آصف سے چمٹی رہتی ...؟

میں نے سوچا کیوں نہ خود کو اس پر نچھاور کر کے اپنی محبت کو عظمت کا روپ دے دوں کہ جب کبھی کھونے کا پچھتاوا مجھے رلائے تو خود کو طفل تسلی دینے کے لئے میرے پاس کم از کم "قربانی" کا ڈھکوسلا تو موجود ہو۔

یہ معمولی میثاق نہیں تھا جو میں خود سے کرنے جا رہی تھی۔ مجھے خود سے بڑی طویل جنگ لڑنا پڑی۔ ہیرے کا کشتہ کھرل کرنا من مارنے سے آسان ہے۔ اپنا اندر مارنے کیلئے اپنے زہر کو خود چوسنے کے لئے بڑا جگرا بڑا ظرف درکار ہوتا ہے جو الحمدللہ میرے پاس تھا۔

میں نے آصف کی دنیا سے نکل جانے کا بے رحمانہ فیصلہ خود پر "ٹن کمانڈمنٹ" کی طرح نافذ کر دیا اور خود سے عہد کیا کہ کبھی ڈگمگاؤں گی نہیں۔ اس کی زندگی میں زہر گھولنے کا تصور ہی میرے لئے اذیت ناک تھا۔

اس فیصلے پر ثابت قدم رہنے کے لئے میں نے خود سے بڑی لمبی جنگ لڑی۔ آصف کے خطوط آتے پیغامات ملتے، پیار بھری دھمکیاں موصول ہوئیں ... وہ مجھے اپنے وعدے یاد دلاتا۔ مجھ سے کہتا تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں ... میں تمہیں پاتال کی تہہ سے ڈھونڈ نکالوں گا ...! تم بھاگ کر دکھاؤ تو سہی!

فرزانہ لکھتی "باجی خدا کے لئے ایسا ظالمانہ فیصلہ نہ کیجئے۔ یہ یکطرفہ کارروائی ہے۔ بھیا کا انتظار کر لیجئے۔ آپ سکون کیسے پائیں گی نہیں نہیں یہ ظلم ہے۔ یہ خودکشی ہے۔ خود کو مارنے کیلئے آپ نے بڑا اذیت ناک راستہ اپنایا ہے"۔

لیکن میں خاموش رہی میں نے کسی کو کسی خط کا کسی بات کا جواب نہ دیا..... جب خودکشی کا فیصلہ کر ہی لیا تو ڈوب کر مرنا کیا اور زہر پھانکنا کیا؟

ایک روز اس کے بچپن کا ایک دوست ڈھونڈتا ہوا ہوسٹل ملنے آگیا جب چپراسی کسی عزیز صاحب کے نام کی چٹ لایا تو میں حیران رہ گئی پھر مجھے اس کا نام یاد آگیا۔ میں نے اس کی چٹ کے پیچھے لکھ کر بھیج دیا۔

"میں اسے ملنا نہیں چاہتی۔"

لیکن وہ ملنے پر بضد رہا۔ اس نے میری میٹرن کی منت سماجت کر کے مجھے دفتر میں ملاقات کے لئے آمادہ کر لیا۔

"باجی! خدا کے لئے اتنی کٹھور نہ بنئے۔ اتنی سنگدلی آصف کو مار ڈالے گی۔ آپ دو زندگیاں ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ آپ کو آپ کا ضمیر کیسے معاف کرے گا؟"

"مسٹر میں کسی کو نہیں جانتی۔ چلے جایئے اور خدا کے لئے آئندہ کبھی مجھ سے ملاقات کرنے نہ آیئے۔ سب سے کہہ دیجئے کہ نجمہ مر گئی"۔

اور اس کا گلا جواب سنے بغیر میں بھاگتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی۔ حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ اب مجھ میں نہیں رہا تھا۔

وہ رات میں نے سسکیاں لے لے کر گزاری میں نے رو رو کر خدا کے حضور التجائیں کیں کہ مولا! مجھ پر رحم کر۔ اگر میں اپنے وعدے سے ہٹ گئی تو بہن کی زندگی کو روگ لگ جائے گا۔ کم از کم مجھے اپنی بہن کو بچانے کے لئے ہی ہمت اور استقامت عطا فرما دے"۔

اور.....!

جس روز مجھے آصف کا وہ خط ملا جس میں لکھا تھا۔

"بے وفا دغاباز۔ مجھے تو یورپ اور امریکہ کی چکا چوند بھی متاثر نہ کر سکی..... میرا حوصلہ تو بڑی بڑی کافر ادا فاحشہ عورتوں کے سامنے بھی نہ ٹوٹا۔ اور تم..... تم نے اتنی جلدی سب کچھ بھلا دیا..... جس روز تم اس کالے جادو کے چکر سے نکلو گی تب تم دیکھنا کیا ہو گا۔ اور ہاں میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔ تمہاری بغیر بھی زندہ رہنا آتا ہے مجھے۔ دیکھ لینا۔ میں مروں گا نہیں....."۔

میں نے خط پڑھا اور اپنی عالیشان اور شکستہ روح کے کھنڈرات پر بیٹھ کر خود پر مسکرا دی۔ میں نے اپنا عہد پورا

کر دیا تھا۔ آصف کو اپنی جھوٹی بے وفائی کا یقین دلا دیا۔

اس روز میری حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ میں نے خود بخود کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی رو دیتی.....

اللہ! ایسی بے بسی بھی کسی کا مقدر نہ ہو.....!

میری ملازمت پر اگر کسی کو خوشی ہوئی تھی تو وہ واحد ہستی ماں تھی۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ میری ماں کو نرسوں سے متعلق خاصی خوش فہمی رہی تھی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ یہ نرسیں کم اور فاحشائیں زیادہ ہوتی ہیں۔ سفید لباسوں کے نیچے اپنے سیاہ اور گناہگار سراپے چھپائے پھرتی ہیں۔ کب تک میں ان سب کے درمیان رہ کر خود کو ان کے رنگ میں رنگنے سے بچا سکوں گی۔ کبھی نہ کبھی تو بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنے ہی ہوں گے۔

اپنے اس زعم میں میری ماں کسی حد تک سچی بھی تھی۔ پہلے چار پانچ ماہ دوران ٹریننگ ہی میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ تمام افواہیں وہ جو اس مقدس پیشہ سے متعلق لوگوں میں پرورش پا رہی ہیں کافی حد تک سچی ہیں۔ دیہات کی معصوم لڑکیوں کو شیطان عورتوں کا روپ دھارنے میں یہاں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ یہ تو گناہوں کی ایسی کال کوٹھری تھی کہ جو بھی اس میں ایک دفعہ پھنسا پھر کبھی اس چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکا۔

پراسرار لوگوں۔ مکروہ شکل عورتوں کی آمد و رفت کا مطلب مجھے جلد ہی سمجھ آنے لگا۔ ہوسٹل کے باہر شام گئے کار آکر ٹھہرتی اور میری کوئی کورس فیلو چپ چاپ ایک کونے سے برآمد ہو کر اس میں بیٹھ کر چل دیتی۔

یہاں کے چپراسی، چوکیدار سب شیطان کے چیلے تھے لیکن شیطانوں کی یہ منڈلی بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ انہوں نے پہلے پہل مجھ پر بڑے دلفریب اور خوب صورت جال پھینکے جن میں ایسی کشش تھی کہ مچھلی خود بخود ان کی طرف کھنچی چلی جاتی۔

ان کے کانٹے سے لگے شکار پر کسی مچھلی کا نہ جھپٹنا چھبنے کی بات تو تھی لیکن ناممکن ہرگز نہ تھی۔ میں نے ان تقدس مآب آدم زادیوں کو بھی دیکھا تھا جن کے بالوں میں کھچڑی پک رہی تھی، جو کنواریاں تھیں اور اپنے کنبوں کو پالنے کے لئے جنہوں نے یہ مقدس پیشہ اپنایا تھا ان کی پاک دامنی کی قسمیں فرشتے بھی کھاتے تھے۔ جن راستوں سے وہ گزرتیں میلی نظریں بھی جھک کر ان کے حضور نذرانہ عقیدت گزارتیں۔ وہ صحیح معنوں میں اس عظیم پیشے کی آبرو تھیں۔

میرا واسطہ ان حوا زادیوں سے بھی رہا جن کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن جو جنسیت کی مکروہ ترین تصویریں بنی گھوم رہی تھیں۔ ان کے بظاہر معصوم چہرے بھی اپنے اوپر لکھی دعوت نہیں چھپا سکتے تھے وہ وظیفہ خوار نرسیں تھیں اور شہر کے امیر ترین ڈاکٹروں سے زیادہ کماتی تھیں۔

اور یہی توقع میری ماں کو مجھ سے تھی.....!

"فلاں کی لڑکی نرس تھی۔ گھر کے حالات بدل دیئے"۔

"فلاں نرس دیکھ لو گھر پر دی سی آر رکھا ہے"۔

"فلاں نے کس ٹھاٹھ سے اپنی بہن کو بیاہا ہے"۔

"فلاں نے اپنا مکان خریدا ہے"۔

لیکن میں نے ایسے فقرے ہمیشہ اس کان سے سنے اور اس کان سے نکال دیئے کہ یہ میری ماں کی فطرت تھی اور انسانی فطرت جبلت کی طرح کبھی بدلتی نہیں۔ کتے کی دم جتنے سال جی چاہے نلکی میں رکھیئے وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ حالات و واقعات نے ہمیں ایسی ایسی پٹخنیاں دی تھیں کہ اگر عقل یا شرم نام کی کسی بھی چیز سے والدہ کی آشنائی ہوتی تو وہ تائب ہو جاتیں لیکن ان کی فرعونیت تو بڑھتی ہی گئی۔

اس روز جب انہوں نے چہکتے ہوئے بتایا کہ شاہ صاحب کو انہوں نے معافیاں مانگ کر منا لیا ہے۔ وہ تو آنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ میں نے بتایا کہ نجمہ ہوسٹل رہتی ہے۔ کون سا گھر رہتی ہے"۔ تو جیسے میرے کلیجے پر چھری سی چل گئی۔

کیا تاریخ پھر خود کو دہرائے گی؟ پھر وہی گھناؤنا کھیل یہاں شروع ہونے والا ہے؟ میری سب محنتیں، قربانیاں کیا اکارت جائیں گی؟ لیکن میرے سوچنے یا کڑھنے کی نہ تو فلک کو پرواہ تھی نہ زمین کے باسیوں کو۔

ایک روز مجھے عابدہ نے بتایا کہ پچھلے بدھ کو ماکھے شاہ گھر آیا تھا اور اگلے بدھ تک ابو ضمانت پر باہر آ جائیں گے۔ ماکھے شاہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مل ملا کر ابو کے کیس کی فائل ہی غائب کروا دے گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری.....۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک روز امی نے "نیاز محمد کی آمد" کا اعلان کر دیا اور شام کو ابو گھر آ گئے۔ انہوں نے باری باری ہمیں گلے لگا کر ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا اور یقین دلایا کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ دنوں میں گھر کے حالات بدل کر رکھ دیں گے۔

ابھی تک ان کی ذہنیت نہیں بدلی تھی۔ ان کے لچھن وہی تھے۔ میں کٹ کر رہ گئی۔ اس سے پہلے تو میں کبھی کبھار گھر آ بھی جایا کرتی تھی۔ جب ابو اور ماکھے شاہ کی واپسی ہوئی تو میں نے اپنی آمد و رفت میں بہت کمی کر دی۔ ایک عابدہ کی فکر مجھے کھائے جاتی تھی۔ اس نے ایف اے میں داخلہ لیا ہوا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کسی روز خدانہ کرے وہ بھٹک نہ جائے۔ لیکن اس نے اپنے کردار اور عمل سے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس نے میری بات کو پلے باندھا ہے اور کبھی غلط راستہ نہیں اپنائے گی۔

ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ بھی یونہی گزر گیا۔ اس دوران امی نے نیا شگوفہ چھوڑا۔

"بیٹی! تم نرسنگ میں باہر چلی جاؤ۔ یہاں کیا رکھا ہے تمہارے لئے تنخواہ سے تو تمہاری اکیلی زندگی بھی مشکل سے گزرے گی"۔

"آپ میری زندگی کی فکر نہ کیا کریں۔ جیسے تیسے گزر ہی جائے گی"۔

میں نے جل بھن کر جواب دیا۔

"تیری مرضی ہے بیٹی۔ پہلے تو نے کون سی میری کوئی بات مانی ہے"۔

انہوں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

ان دنوں آئے روز نرسیں مڈل ایسٹ کے ممالک میں نوکری کے لئے جاتی رہتی تھیں اور حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر کئی ادارے اس سلسلے میں سرگرم عمل تھے لیکن میں نے کبھی اس مسئلے پر غور ہی نہ کیا کیونکہ عابدہ کو کسی منزل تک پہنچا ہوا دیکھے بغیر میں اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

ایک روز ہسپتال سے واپسی پر میرے کمرے میں ایک خط میرے نام آیا پڑا تھا۔ میں نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا کیونکہ تحریر عابدہ کی تھی۔

"باجی!

اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ پر جو کچھ گزرے گی اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتی ہوں۔ آپ مجھے بے شرم، بے حیا، بے وفا، بہت کچھ کہیں گی لیکن خدارا پہلے میرا کیس سن لیجئے۔ اس کے بعد مجھ پر کوئی فیصلہ کیجئے

باجی! میں نے آج تک کئی معاملات آپ سے محض اس لئے چھپا رکھے تھے کہ میں یہ کبھی نہیں چاہتی تھی کہ اپنی ایسی عظیم بہن کو جس نے صرف میری خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے مزید کوئی دکھ پہنچاؤں۔ کاش میں آپ کی طرح مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتی.....!

باجی! شاید آپ نہیں جانتیں کہ امی نے ماکھے شاہ کے توسط سے میرا رشتہ ایک کروڑ پتی رنڈوے کے ساتھ کرنے کی حامی بھری تھی اور اس سلسلے میں ماکھے شاہ سے خاصی رقم بھی وصول کر لی تھی۔ یہ ایک بوڑھا زمیندار ہے جس کا مشغلہ ہم جیسی لڑکیوں کو بیویاں بنانا اور مرواد ینا یا طلاق دے دینا ہے۔ اشفاق سے میری آشنائی ایک سال پرانی ہے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ آپ کی یہ گناہگار بہن اس معاملے میں بہت خوش قسمت تھی کہ اس کا محبوب نہ صرف اس پر جان دینے والا بلکہ اس کیلئے ہر مقابلے پر ڈٹ جانے والا بھی ہے۔ اشفاق اپنے پڑھے لکھے والدین کا اکلوتا بیٹا اور بزنس مین ہے۔ اس کے گھر والوں کو اس پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا مجھے آپ پر ہے۔ میں نے اپنے تمام حالات کا ذکر اس سے کیا وہ تو پہلے ہی مجھے اس گندے ماحول سے نکالنے پر تلا ہوا تھا میں نے ہی بی۔اے کی ضد پکڑ رکھی تھی۔

باجی وہ مجھے اپنے والدین کے پاس لے گیا بڑے اچھے آدمی ہیں انہوں نے میری ساری رام کہانی سن کر کہا کہ بیٹی پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ یہ معمولی فیصلہ نہیں میں نے ان کے بضد ہونے پر بار بار سوچا اور اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ انہوں نے مقامی مجسٹریٹ کے روبرو میرا بیان قلمبند کروایا اور بڑے پروقار طریقے سے اپنے گاؤں لے جا

کر اشفاق کا اور میرا نکاح کر دیا۔

ہم دونوں میاں بیوی اب اسی گاؤں میں حالات سدھر جانے تک قیام کریں گے۔ پھر ہم دوسرے شہر میں منتقل ہو جائیں گے۔ میری کہانی کی صداقت کا ثبوت صرف یہ ہے باجی کہ میں آپ کو اپنا ایڈریس لکھ رہی ہوں تاکہ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کی بہن کا فیصلہ غلط ہے یا!

باجی..... خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں صرف یہ جان کر کہ آپ کی طرح میں حالات کا مقابلہ نہ کر پاتی اور جیتے جی مر جاتی۔ آخر میں اپنی بہن کی التجا بھی سن لیں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے بے شک زہر دے دینا لیکن خدا کے لئے ابھی امی یا ابو کو میرا ایڈریس نہ دینا۔

اشفاق اور ان کے گھر والے بھی میری طرح بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا کرے میری زندگی میں مجھے کوئی ایسا موقع میسر آ جائے کہ میں آپ کے احسانات کا کچھ بدلہ اتار سکوں۔

معافی کی خواستگار آپ کی نالائق بہن

عابدہ

○

عابدہ کا خط پڑھ کر نہ تو مجھے خوشی ہوئی نہ ہی دکھ پہنچا۔ وہ ابھی اتنی ہوشیار نہیں ہوئی تھی کہ کسی کی صحیح نیت کا اندازہ کر سکتی۔ میرا جی چاہا کہ اُڑ کر اس تک پہنچ جاؤں۔ لیکن فی الوقت میں نے اس مسئلے پر خاموشی ہی مناسب سمجھی اور اس معاملے کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا.....

اگر وہ سب کچھ صحیح تھا جو عابدہ نے لکھا تو وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی اور اللہ میری محنتیں راس لے آیا تھا۔ میں نے خط پر لکھا ایڈریس اپنی ڈائری میں نوٹ کیا اور خط جلا کر ضائع کر دیا۔

دوسرے ہی روز امی ہوسٹل آن دھمکیں۔

"کچھ عابدہ کی خبر بھی ہے؟" انہوں نے چھٹتے ہی کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس بات کا جواب بھی آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ کیوں کیا ہوا؟" میں نے بالکل انجان بنتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"وہ چھنال پچھلے چار روز سے غائب ہے۔" امی غصے سے کھول رہی تھی۔

"اور آپ آج میرے پاس تشریف لا رہی ہیں؟" میں نے اپنے لہجے کی کاٹ میں کمی نہ آنے دی۔

"میں نے سمجھا شاید کہیں ....."

"جی ہاں! آپ کو اس سے زیادہ سمجھ بھی کیا آ سکتی تھی۔ لیکن آپ گھبرائی ہوئی کیوں ہیں۔ وہ تو دادی مرحومہ کی نہیں آپ کی تربیت یافتہ ہے"۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹی! میرے تو نصیب پھوٹ گئے۔ تم نے کبھی مجھے ماں نہ سمجھا اور وہ مجھے چھوڑ کر کسی یار کے ساتھ منہ کالا کر گئی۔" پھر میری طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔ "ہاں ہاں۔ تم تو پہلے بھی یہی چاہتی تھیں۔ خیر میں بھی ملک دین محمد کی بیٹی ہوں۔ اڑالے چار دن گلچھرے۔ یہ لڈوؤں کی یاریاں چار ہی دن کی ہوتی ہیں۔ جس روز یار کا دل بھر گیا وہ دھکے دے کر باہر نکال دے گا اور میں..... میرے لئے تو وہ مر چکی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے رونا شروع کر دیا۔

"اچھا خدا کے لئے یہاں رونے دھونے مت۔ کیوں تماشہ دکھائیں گی سب کو۔" میں نے ان کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ دروازے تک میں انہیں چھوڑنے آئی تو یہ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا کہ باہر ماکھے شاہ امی کا منتظر تھا۔

شام کو ڈیوٹی آف ہونے کے بعد میں گھر آئی جہاں چنڈال چوکڑی جمی ہوئی تھی وہ لوگ عابدہ کی گمشدگی پر بحث کر رہے تھے۔ عابدہ کی عقل پر میں عش عش کر اٹھی۔ اس نے اس معاملے کی ہوا مجھے ہی نہیں گھر کے کسی فرد کو بھی نہ لگنے دی تھی۔ وہ اصل میں تھی ہی بہت سمجھدار لڑکی۔

جس روز میں نے امی کے ساتھ پہلی جھڑپ لی تھی اور ان کے "نوجوان دوستوں" کو اپنے کمرے سے باہر نکالا تھا اس روز کے بعد اس کے رویے میں یکسر تبدیلی آ گئی تھی۔ اس نے مستقبل کے لئے اسی دن سے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

بے چاری تھی تو عورت۔ جیسے ہی کوئی مضبوط سہارا میسر آیا اس نے میری طرح اسے کھونے کے بجائے فوراً خود کو پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرا دیا قدرت خود بھی مہربان رہی اور اس کے لئے بہتر اور سازگار حالات پیدا ہوتے گئے امی کا اس کو ایک طرح سے فروخت کرنا اس کی بہتری کا بہانہ بن گیا اور اس نے بجائے حالات کا انتظار کرنے کے خود کو پہلے ہی محفوظ پناہ گاہ میں مقید کر لیا۔ عابدہ کے اس فیصلے پر مجھے اس لئے تعجب نہ ہوا کہ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی اس کا اگلا اقدام یہی ہوتا۔

میرے دل سے ایک ہی دعا بار بار نکلتی تھی کہ الٰہی اسے دھوکہ نہ ہو جائے۔ وہ ایسی خود دار اور حساس طبیعت لڑکی تھی کہ اگر ایسی بات ہو گئی تو فوراً وہ خودکشی کر لے گی.....!

کمرے میں پہنچنے تک کسی کو میری آمد کی خبر نہ ہوئی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے دروازے سے کان لگا دیئے۔ ماکھے شاہ بول رہا تھا۔

"نیاز محمد! ماکھے شاہ نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اگر تیری بڑی لڑکی کا معاملہ ہوتا تو میں مان لیتا کہ وہ اتنی راز داری برت سکتی ہے۔ عابدہ میرے ہاتھوں میں جوان ہوئی ہے۔ زہراں! میں اس کی رگ رگ سے واقف

ہوں۔ کسی کی مدد کے بغیر وہ بھاگ نہیں سکتی۔ یہاں ضرور اس کا کوئی رازدار ہے۔"

"شاہ جی! میری عقل میں آپ کی بات نہیں بیٹھ رہی۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کھل کر کہیں۔" والد کی آواز سنائی دی۔

"تمہیں اگر عقل ہوتی تو یہ دن دیکھنے سے پہلے لاکھوں میں کھیل رہے ہوتے کروڑپتی! اسامی ہے وہ الو کا پٹھا۔ جس نے ایڈوانس ہی بیس ہزار روپیہ دے دیا وہ آگے کیا نہ کرتا۔ اوئے اب بھی سمجھ جاؤ بے وقوفو! تمہاری بڑی لڑکی ضرور اس کی رازدار ہے۔ اس سے ٹوہ لگاؤ۔" ماکھے شاہ کی خباثت میری سماعت سے ٹکرائی۔

"شاہ جی! آپ نے تو اس کے ہاتھ دیکھ رکھے ہیں۔ اب کس کو بتانے کا ارادہ ہے۔" ان میں سے ایک بولا اور سب کے قہقہہ مار کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

ٹھیک ہے بچو۔ ہنس لو۔ کسی روز روؤ گے کہ ماکھے شاہ کی بات کیوں نہ مانی۔ میں تو مر کر بھی سوا لاکھ کا ہوں ملک جی۔" اس نے فقرہ کسنے والے کو مخاطب کیا۔

"میں تو لڑکی ڈھونڈنے کے چکر میں بھی اس لینڈ لارڈ کی اولاد سے دس بیس ہزار اور ہتھیا لوں گا۔ میرا تو وہ بچہ ہے۔ اور رہی ہاتھ دیکھنے والی بات تو ابھی اس نے ماکھے شاہ کے ہاتھ نہیں دیکھے۔ جلدی دیکھ لے گی۔"

"شاہ جی! چھوڑیں ملک کی بات کو کوئی اور راستہ نکالیں۔ اگر لونڈیا یوں نکل گئی تو ہم سب مارے جائیں گے۔" میری ماں بولی۔

"بس پھر میری بات دھیان سے سن لو۔ میرا تجربہ کہتا ہے زہراں کہ تمہاری بڑی لڑکی کو عابدہ کا علم ہے۔ لیکن ایک اور بات کا خیال رکھنا اس کو ابھی اس بات کی ہوا بھی نہ لگے کہ ہمیں اس پر شک ہو گیا ہے۔ بس چپ چاپ اس کی حرکتوں پر نظر رکھو۔ میں کسی بالکے کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ اس کی نگرانی کرتا رہے۔ ہوش اور ہسپتال میں بھی میرے ایک دو بندے اس کے ملنے جلنے والوں پر نظر رکھیں گے۔ کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ اگر تیری لڑکی اس ملک میں ہے تو بچ کر نہیں جا سکتی۔ نیاز محمد! ماکھے شاہ کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اس کا اندازہ تمہیں تو ہو گیا ہو گا۔ تیری فائل غائب کروا دی ہے۔ ہے کوئی مائی کا لال اس شہر میں جو ایسی واردات کر سکے۔" ماکھے شاہ نے مرغے کی طرح گردن پھلائی۔

"یار نیاز محمد! پہلی بات تو میں نے مذاق میں کر دی تھی۔ واقعی شاہ جی بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" ملک شرمندگی سے بولا۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ملک جی! وہ نظام دین کی لڑکی والا کیس بھول گئے تم لوگ۔ آخر ماکھے شاہ کی بات ہی سچ نکلی۔ اب دیکھ لو کیسی سیدھی ہے لڑکی۔ مجال ہے جو کبھی سوچ بھی غلط ہو۔"

اس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ باقاعدہ گروہ کی شکل میں اس مکروہ دھندے سے

منسلک ہیں۔ انہوں نے "مجھ پر نظر رکھنے" کے لئے جو اقدامات کئے تھے ان کی تفصیل اب طے ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے والد کو کسی کام سے اٹھتے دیکھا تو بے پاؤں دروازے سے باہر نکل آئی اور آواز کرتی ہوئی دوبارہ اسی طرح واپس آئی جیسے میں ابھی باہر سے اندر داخل ہوئی ہوں۔

میرے قدموں کی آہٹ پر والد میری طرف متوجہ ہوئے۔

"کچھ پتہ چلا ابو؟" میں نے ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس طرح ان سے پوچھا جیسے میں اس سلسلے میں ان سے زیادہ پریشان ہوں۔

یہاں معاملہ اگر باپ بیٹی والا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ میرے باپ نے تو اپنی خاندانی شرافت کو دھتکار کر خود کو اس طرح ماں کے رنگ میں رنگا تھا کہ جیسے وہ تھا ہی اسی میں سے اور غلطی سے زندگی کے بیس پچیس سال اس نے اپنے والدین کے ساتھ بسر کئے تھے۔

"جائے گی کہاں ..... میرا نام بھی نیاز محمد ہے۔ ایک دفعہ پتہ چل جائے اگر اس کی اور اسے خوار کرنے والے دونوں کی ٹانگیں تڑوا کر گھر میں نہ ڈال دوں تو اپنے باپ کا جنانہ جانا....." اس نے بدمعاشوں کے سے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دل سے بے اختیار دعائیں نکل رہی تھیں کہ عابدہ کا پتہ نہ چلے اور اس بھید پر اس وقت تک پردہ ہی پڑا رہے جب تک اس کے پاؤں اتنے مضبوط نہ ہو جائیں کہ وہ ماکھے شاہ جیسے خبیث لوگوں کی دسترس سے محفوظ رہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ اڑ کر اپنی خوش قسمت بہن تک پہنچ جاؤں لیکن مصلحت خاموش رہنے دیکھنے اور انتظار کرنے میں تھی۔ میں نے فی الوقت اس کو بھلا دینا ہی بہتر سمجھا اور اپنی ڈائری سے وہ ایڈریس ہی نکال کر ضائع کر دیا۔ لیکن میرے ذہن سے کوئی کھرچ کھرچ کر بھی اسے نکال نہ پاتا۔

○

رات کو ماں میرے کمرے میں آئی اور بڑی ہوشیاری سے مجھے سمجھانے لگی کہ ماں باپ آخر ماں باپ ہی ہوتے ہیں۔ وہ اولاد کی نظروں میں لاکھ برے سہی، لیکن ان کے دشمن نہیں بن سکتے۔ عابدہ نے یہ بہت برا کیا اگر اس نے کوئی غلط قدم اٹھا ہی لیا ہے تو اسے چاہئے کہ ماں باپ کو اب بھی کم از کم اعتماد میں تو لے۔ وہ اس کے دشمن نہیں ہیں۔

"بیٹی! مجھے اللہ پاک کی قسم ہے اگر وہ اب بھی مجھے مل جائے تو میں سات ہاتھوں سے اسے قبول کر لوں۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے اگر کوئی غلطی کر بھی لی ہے تو خوش تو ہے۔ کہیں خدانخواستہ اس کے ساتھ معاملہ زبردستی والا نہ ہو۔ وہ اپنے گھر میں خوش رہے ساری زندگی ہم سے نہ ملے لیکن ہمیں علم تو ہو کہ ہماری بیٹی

ہے کہاں۔" یہ کہہ کر اس نے باقاعدہ سُوے بہانے شروع کر دیے۔

میں امی کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور بڑی ہوشیاری سے ان کی ہدایات کی تان ہیر پھیر کر اسی ایک فقرے پر لے آتی۔

"اب روتی کیوں ہو ماں! وہ تو تمہاری چہیتی تھی۔ تمہاری دشمن تو میں ہوں۔ دیکھ لیے اپنی لاڈلی کے لچھن؟"

کیا مجال جو میں نے اسے اس معاملے کی ہوا بھی لگنے دی ہو۔ رات کافی دیر گئے تک میرا دماغ چائنے کے بعد بالآخر وہ بے نیل و مرام واپس لوٹ گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور لمبی تان کر سو رہی۔

صبح اٹھ کر میں نے ناشتہ کیا اور ہوسٹل چلی آئی۔ سب سے پہلے میں نے عابدہ کو خط لکھ کر اسے نئی زندگی کی مبارکباد اور دعائیں دیں اور پھر حالات لکھ کر اسے یہ بھی بتا دیا کہ گھر والوں کو مجھ پر شک ہے اور وہ لوگ میری نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر میں کہیں آگے پیچھے ہوئی تو قیامت آجائے گی۔ میں نے اسے کہا تھا۔

"بنو! تمہارا فیصلہ غلط ہے یا صحیح یہ کبھی نہ سوچنا۔ اب صرف اس پر جمے رہنا۔ اس گھر سے تمہاری لاش ہی باہر نکلے ورنہ زندہ درگور ہو کر رہ جاؤ گی۔"

آخر میں لکھا تھا کہ میرے خط کا جواب ہرگز نہ دینا۔ نہ ہی مجھ سے کسی بھی طرح کا رابطہ قائم کرنا۔ میرے اگلے خط کا انتظار کرنا۔ اس میں باقی تفصیلات لکھوں گی۔ میں تمہاری کامیاب زندگی کے لئے دعائیں کرتی رہوں گی۔

میرے معمولات میں بالکل فرق نہ آیا۔ نہ ہی میں نے اپنی کسی غیر معمولی حرکت سے یہ ظاہر ہونے دیا کہ میرے ساتھ کوئی غیر معمولی حادثہ گزرا ہے۔ جو طریق واردات وہ لوگ میری نگرانی کے لئے اپنانے والے تھے اس کی سُن گن میں نے لے لی تھی اور خاصی محتاط بھی ہو رہی تھی

ضرورت سے زیادہ محتاط رویہ بھی میں نے نہیں اپنایا تھا تاکہ خواہ مخواہ کسی کو میرے متعلق سوچنے یا کوئی غلط رائے قائم کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

○

زندگی جیسے جیسے گزر رہی تھی کبھی کبھی رات کے کسی پہر دن کو کسی گوشہ تنہائی میں اچانک آصف ایک سوال بن کر سامنے آن کھڑا ہوتا۔

بتاؤ نجمہ۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں خود کو تباہ کرنے پر تلی ہو؟ اور میں بے بسی سے صرف رو دیتی کہ رونے کے علاوہ اور کسی بات پر میرا اختیار نہیں تھا۔

فرزانہ نے میری طرف سے بالکل مایوس ہو کر مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن ایک روز اچانک اس کا خط آگیا۔

"باجی!

جی تو نہیں چاہتا کہ آپ جیسی بے وفا اور دغاباز لڑکی کو مخاطب کروں لیکن کیا کروں۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے اور وہ بھی جان سے پیارا۔ امریکہ جانے سے پہلے آصف نے مجھے کہا تھا۔ "فرزانہ میری امانت کا خیال رکھنا۔"

سوچتی ہوں اب وہ دو ماہ کے بعد انجینئر بن کر پاکستان لوٹ رہا ہے تو اسے کیا منہ دکھاؤں گی۔ کاش اس نے آپ کو سمجھنے میں اتنی شدید غلطی نہ کی ہوتی۔"

تو آصف واپس آبھی گیا۔

اب بتاؤ کہاں جاؤ گی بھاگ کر؟

آصف کا سامنا کر پاؤ گی؟ اپنے ساتھ کیا عہد نبھا سکو گی یا ساری زندگی اسے احساس محرومی کا شکار بنا کر اس سے چھپی رہو گی اور وہ بے چارہ محض اس لئے تمہیں اپنے ساتھ لگائے رکھے گا کہ اس نے تمہیں اپنانے کا وعدہ کیا تھا۔؟ نہیں نجمہ بی! تمہارا منصب یہ نہیں کہ اپنے محبوب کو جیتے جی مار ڈالو۔ تم اس کی دلہن بننے کے قابل نہیں ہو نجمہ! اس کی شریک حیات بننے کا حق اس جیسی کسی لائق فائق لڑکی کو ہے تم بیچاری ایک معمولی سی نرس اس کے قابل ہرگز نہیں۔"

اف میرے خدا پھر میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟

اس سوال کا جواب میرے سامنے رکھے اخبار میں موجود تھا۔

"غیر ممالک کے لئے نرسوں کی ضرورت" کے عنوان سے ایک اشتہار موجود تھا جس میں لکھی تمام شرائط پر میں پوری اترتی تھی۔ اب عابدہ نے بھی اپنا گھر بسا لیا تھا اور جلد یا بدیر اس کی طرف سے مایوس ہو کر بہر حال میرے والدین اور ان کی چنڈال چوکڑی کی للچائی ہوئی نظریں میری طرف ہی اٹھتیں۔ میں کوئی جوڈو کراٹے کی چیمپئن تو تھی نہیں اور اگر ہوتی تو بھی کب تک ماکھے شاہ جیسے شیطانوں کا مقابلہ کر پاتی؟

پھر امی بھی تو کب سے کہہ رہی تھی یہ سب کچھ۔ ان کو بھی تو غیر ملکی فریج ٹی وی، وی سی آر اور کپڑے درکار تھے۔ ان کو اعتماد میں لے کر یہاں سے نکل جاؤ نجمہ بی! کہ یہی فلاح کی راہ ہے۔ ماں باپ کی مرضی بھی پوری ہو جائے گی اور آصف کا سامنا کرنے سے بھی بچ جاؤ گی۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں نے اس کمپنی کو درخواست بھیجی تھی۔

۵

درخواست کے ساتھ اپنی "تازہ تصویر" کی شرط بھی لکھی تھی۔ شاید "میری تصویر" ہی کا کرشمہ تھا کہ مجھے درخواست بھیجنے کے چار پانچ روز بعد ہی کمپنی کی طرف سے "انٹرویو کال" آ گئی۔ جب ماں کو میں نے یہ مژدہ جانفزا سنایا تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ تو مارے خوشی کے اچھل پڑیں۔

میرے ساتھ ہسپتال کی کئی اور نرسوں نے بھی درخواستیں دی تھیں اور اب وہ سب ایک دوسری سے خواہ مخواہ حسد کرنے لگی تھیں۔

انٹرویو والے دن میری ماں نے مجھے خاص طور پر اپنی نگرانی میں نہ صرف تیار کروایا بلکہ میک اپ کرنے کا حکم بھی ملا۔ جب میں بن سنور کر شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تو زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنی خوب صورتی کا احساس ہوا۔

میری ماں مجھ سے زیادہ بنی سنوری میرے ساتھ ہی گئی تھی۔ جب ہم اس دفتر میں پہنچے تو میری ماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے ہم یورپی ملک میں آ گئے ہوں۔ ایک خوب صورت اور نازک اندام سیکرٹری نے ہماری راہنمائی ایک ائر کنڈیشنڈ کمرے کی طرف کی جہاں ایک میز پر تین مختلف رنگ کے ٹیلیفون رکھے تھے اور جس کی سجاوٹ میں بلا مبالغہ ہزاروں روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹی وہاں بیٹھ گئیں۔ کرسی پر کوئی نہیں تھا۔

اتنے میں ہمارے پیچھے دروازہ کھلا اور ایک انتہائی قیمتی سوٹ میں ملبوس سمارٹ سا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی شخصیت اتنی پرفریب تھی کہ میں بھی اپنی ماں کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھیے بیٹھیے تشریف رکھیے"۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی تعریف؟" نظروں ہی نظروں میں میری قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جی یہ میری بیٹی نجمہ ہے"۔ میرے بجائے میری ماں نے بڑی انکساری سے کہا۔

"کیا فرمایا۔ آپ کی بیٹی! معاف کیجئے میں تو آپ کو ان کی بڑی بہن سمجھ رہا تھا"۔ ..... اس نے عورت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور ایک فقرے میں میری ماں کو لوٹ لیا۔

اس اثنا میں ایک باوردی ملازم ہمارے لئے چائے لے کر آ گیا۔ زندگی میں اتنے شاندار اور قیمتی برتنوں میں شاید ہم نے پہلی مرتبہ چائے پی تھی۔ میری ماں تو کیا میں بھی اب آہستہ آہستہ اس کے طلسم میں پھنستی اور اس سے مرعوب ہوتی جا رہی تھی۔

چائے پینے کے دوران میں کم از کم پانچ چھ مرتبہ مختلف فونوں کی گھنٹیاں بجی تھیں اور ہر مرتبہ وہ نوجوان یہی کہتا تھا کہ ابھی ان کے پاس جگہ نہیں ہے۔

"نجانے کیسے بیوقوف لوگ ہیں۔ اب ہم نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر ایک کو باہر لے جانے کا"۔ اس نے آخری فون سن کر میری ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور میری ماں نے اس کے جواب میں فوراً سر ہلا دیا۔

"معاف کیجئے گا آپ ذرا تشریف رکھیں میں مس نجمہ کو انٹرویو کے لئے لے جاؤں"۔ اس نے میری ماں سے بڑے مؤدب لہجے میں اجازت طلب کی۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں؟"۔ میری ماں کی تو مراد بر آئی تھی۔

میں اس کے اشارے پر سحر زدہ سی اٹھ کر چل دی۔

دوسرا کمرہ بھی اس سے ملتا جلتا تھا اور انٹرویو لینے والا بھی وہی تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ آخر اس نے میری ماں سے علیحدہ ہونا ہی کیوں ضروری سمجھا تھا؟

"معاف کیجئے گا آپ کی امی بھی باہر جائیں گی؟" اس نے مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک قیمتی سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"جی نہیں"۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"برا نہ مانیئے میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ جو آئی ہیں"۔ وہ مسکراتا ہوا میرے سامنے ہی ایک شاندار صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی نہیں۔ میں معافی چاہتی ہوں" میں نے نجانے کیوں یہ فقرہ کہہ کر اس کی غلط فہمی میں مزید اضافہ کر دیا۔

انٹرویو کے دوران اس نے سوائے مجھ سے "فری" ہونے کی کوشش کے اور کچھ نہ کیا۔ ایک بھی سوال اس نے نرسنگ سے متعلق نہ پوچھا۔ اس کے سوالات پوچھنے کا انداز اتنا بے ہودہ تھا کہ اچھے بھلے آدمی کو غصہ آ جائے لیکن میں نجانے کیوں چپ رہی۔

آدھ گھنٹے تک ہم دونوں گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہ میرے ساتھ ہی اس کمرے میں آ گیا جہاں میری ماں بے چینی سے نتیجے کی منتظر تھی۔

"آپ بے فکر رہیئے آنٹی! نجانے مجھے آپ لوگوں سے کیوں انس سا ہو گیا ہے۔ آپ کے قریب ہی میرے ایک رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ میں اس طرف گزر تا رہتا ہوں۔ جلدی ہم آپ کو نتیجے سے مطلع کر دیں گے"۔

"بیٹے ہمارے ہاں بھی ضرور آنا"۔ بالآخر میری ماں اس کے جال میں کھل پھنس گئی۔

پانچویں چھٹے روز ہی "بیٹا" ہمارے گھر آ گیا۔

میں اس وقت گھر نہیں ہسپتال ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ اس فرم کا منیجر ہے۔ باقی لوگ تو نہیں مانتے لیکن وہ کچھ بھی ہو جائے نجمہ کو ضرور باہر بھیجے گا۔ اس نے میری ماں پر چکنی چپڑی باتوں سے جادو ہی تو کر دیا تھا ورنہ ایسا کیوں نہ ہوتا ہوس نے ان کی آنکھوں پر پٹی جو باندھ رکھی تھی۔ وہ تو سادن کے اندھے بن چکے تھے جنہیں سوائے ہریالی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میری ماں بضد تھی کہ وہ اپنی "لاکھ مصروفیت" کے باوجود نجمہ سے مل کر ہی جائے۔ ماں نے مجھے ہسپتال فون کر کے گھر آنے کو کہا۔

جب میں گھر پہنچی تو میرے والدین اس کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میری والدہ کھل اٹھی۔

"لو بھئی اب تم لوگ بیٹھو مجھے تو گھر کا کام بھی کرنا ہے" میری ماں بہانہ بنا کر اٹھ گئی۔ اب میں اور وہ اکیلے ہی وہاں موجود تھے۔ میری ماں مجھے برباد کرنے پر تل گئی تھی یا میں خود برباد ہونے پر۔

بہر کیف جو کچھ بھی ہوا اس عمل کو وقوع پذیر ہو کر ہی رہنا تھا۔

ثمانی میسر آتے ہی اُمی کے بیٹے "لے پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔

"میرا نام پرویز ہے"۔ اس نے غنیمت لمحوں کا احساس کیا۔ اور مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ابھی تک میرا نام بھی دریافت نہیں کیا؟"

اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہی کیونکہ میرا ذہن کہیں اور تھا۔ کسی اور کے پاس۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ آصف کے سوا کوئی اور نوجوان اس طرح تخلیئے میں مجھ سے مخاطب ہو گا۔ ماں بظاہر یہی سمجھ رہی تھی کہ اس نے بالآخر اور اچانک بازی جیت لی ہے لیکن یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میں جان بوجھ کر ہارنے پر تل گئی ہوں۔

"آپ شاید سوچ رہی ہیں کہ میں کوئی عام سا نوجوان ہوں اور آپ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا کر آپ پر ڈورے ڈالنے کی فکر میں ہوں"۔ اس نے میرا عندیہ بھی بھانپ لیا۔

"نہیں۔ پرویز صاحب!" میں نے بڑی لمبی سانس لی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں"۔

"مس نجمہ!" اس نے دوبارہ سٹارٹ لیا۔ "میرا تعلق جس فرم سے ہے وہاں مجھے ہر دوسرے تیسرے روز دنیا بھر کی درجنوں خوب صورت عورتوں سے پالا پڑتا ہے۔ مجھے کسی شے کی کمی نہیں مس نجمہ.....! اگر خدانخواستہ میرا ایسا ہی کوئی غلط ارادہ ہوا تو آپ ہی سوچئے آخر مجھے رکاوٹ کس بات کی؟"

اس نے بات ختم کر کے پھر میری طرف بڑی جچی نظروں سے دیکھا۔

جواب میں میری خاموشی کو اس نے دوبارہ شاید "نیم رضامندی" سے تعبیر کیا ہو گا

"شاید آپ کو میرے خلوص پر ابھی یقین نہ آئے لیکن اس خدشے کے باوجود کہ آپ برا مان جائیں گی مجھے یہ کہنے دیجئے کہ آپ کی سادگی نے مجھے لوٹ لیا ہے۔"

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"مس نجمہ! میں نے اس کم عمری میں بڑا تجربہ حاصل کیا ہے۔ یقین مانئے آج تک واسطہ کھوکھلے چہروں ہی سے پڑا۔ جس روز سے آپ سے ملا ہوں نجانے کیوں مجھے احساس ہونے لگا ہے جیسے میری کوئی برسوں سے کھوئی ہوئی انتہائی قیمتی شے مجھے واپس مل گئی ہے"۔

اس کا لہجہ خاصا جذباتی ہونے لگا تھا۔ اتنا جذباتی کہ مجھے اس کی ایکٹنگ اصلیت نظر آنے لگی۔

میری نفسیاتی کیفیت بڑی عجیب و غریب سی ہو رہی تھی۔ آصف سے علیحدگی کے بعد سے میں جس "روحانی یتیم پن" کا شکار ہوئی تھی اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کئی دفعہ تو مجھے بے اختیار خود پر رحم آنے لگتا تھا۔ جب پرویز مجھ سے باتیں کر رہا تھا تو میرے احساسات بڑے عجیب و غریب تھے۔ مجھے اس کی باتوں سے اگر دلچسپی نہیں تھی تو وہ کم از کم بری بھی نہیں لگ رہی تھیں۔

اور وہ..... ایسی باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھے اپنی محرومیوں کی ایسی درد بھری داستان سنائی کہ میرا دل بھر آیا۔

"ماں بچپن میں مر گئی۔ باپ نے بیاہ رچا لیا۔ سوتیلی ماں نے دونوں بہن بھائیوں کو دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ ایک رشتہ دار نے خدا خوفی کر کے سہارا دیا اور اب جب کسی قابل ہوئے ہیں تو سارا خاندان اس کے لئے رشتے لئے پھرتا ہے کیونکہ اس نے اپنی بہن کو سونے میں تول کر بیاہا ہے"۔..... یہ اور ایسی بے شمار باتیں۔

"مس نجمہ! شاید آپ مجھے اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھیں کہ ایف اے کرتے ہی مجھے ایسی شاندار فرم میں نوکری مل گئی جس نے میری ہزاروں روپے تنخواہ ہی مقرر نہیں کر رکھی بلکہ ہزاروں روپے میرے الاؤنس بھی بن جاتے ہیں لیکن زندگی میں بہت بڑا خلا رہ گیا ہے۔ جانے یہ خلا کب پر ہو گا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے میری

قسمت میں محبت کا خانہ ہی نہیں۔" یہ کہتے ہی باقاعدہ اس کے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔ مجھے یہ شخص اپنے جیسا لگا۔ بکھرا ہوا اور نامکمل انسان۔

عجیب حسن اتفاق تھا۔ مجھے ملا بھی تو اپنے ہی جیسا۔ اس لمحے میں نے یہی سوچا کہ قدرت کو شاید میری "قربانی" پسند آگئی ہے اور اس نے پرویز کی شکل میں میرے آصف کا نعم البدل پیدا کر دیا ہے۔ مجھے محبت ملی اور چھن گئی تھی اور وہ ابھی تک بھی محبت کا متلاشی تھا۔

جب انسان کسی بات کو قبولنے پر آجائے، کوئی نظریہ، خواہ وہ دوسروں کی نظر میں باطل ہی کیوں نہ ہو، اپنا نام چاہے تو اس کیلئے دلائل بھی خود ہی اپنے مطلب کے مطابق تلاش کر لیتا ہے۔ اس لمحے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ کہ اگر اس کا مقصود کوئی "غلط حرکت کا ارتکاب" ہی ہے، تو واقعی جس فرم میں اور جس طرح کا کام وہ کرتا تھا اس کے لئے کسی شے کی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر فخر کر سکتی تھی۔ خود میری ہی بہت سی ایسی واقف کار تھیں جو مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں اور باہر جانے کی کوئی بھی قیمت بخوشی ادا کر سکتی تھیں۔ مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے۔ یوں بھی میں نے چونکہ عورت کا زیادہ تر برا ہی روپ دیکھا شاید اس لئے میرے وجدان نے میری غلط راہنمائی کی اور میں نے سوچا بری عورتوں کی کمی کیا ہے؟ اور پھر پرویز کو.....!

○

پرویز سے میں نے کچھ نہ کہا لیکن میرا مثبت رویہ اسے میرا مدعا سمجھانے کے لئے کافی تھا یوں بھی وہ خاصا سمجھ دار شکاری تھا اور شکار کو خاصا بھگا کر مارنے کا عادی۔ اس نے تیسرے چوتھے ہی روز مجھے فون کر دیا۔

مجھے آج تک ہوسٹل میں کسی مرد کا فون نہیں آیا تھا۔ جو لڑکی میرے کمرے تک فون کی اطلاع دینے آئی تھی، اس نے بڑی ہی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور قدرے مسکرا کر یہ اطلاع مجھ تک پہنچائی کہ کوئی صاحب پرویز مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ میں گڑبڑا کر اٹھی۔

"برا تو نہیں مانا آپ نے....." اس نے میری "ہیلو" سنتے ہی پوچھ لیا۔

"جی نہیں....." میں اور کیا کہتی۔

"دراصل مس نجمہ! میں آپ کو ایک بہت بڑی خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ آپ ایسا کیجئے۔ آج پانچ بجے شام ہوٹل شیراز پر آجایئے۔ میں دروازے کے باہر ہی آپ کا انتظار کروں گا"۔ میری گھبراہٹ سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

"جی میں میں....." میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس اب آپ کچھ نہ کہئے۔ پلیز!" اس نے میری بات کاٹ دی۔ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولا۔

"میں نے ابھی سے آپ کا انتظار شروع کر دیا ہے۔ اچھا خدا حافظ....." سلسلہ کٹ گیا۔

پانچ بجے تک میرے اندر یہی کشمکش رہی کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ بالآخر مجھے جانا ہی پڑا۔ میں آدھا گھنٹہ دیر سے پہنچی تھی اور وہ نہ جانے کب سے میرا وہاں منتظر تھا۔

"شیراز" ہمارے شہر کے ان ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ جس تک مجھ ایسوں کی رسائی کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اشارے سے مجھے اپنی قیمتی کار دکھا دی تھی۔

اس لمحے میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات سمائی تھی کہ آصف کے لئے دی گئی میری قربانی اللہ تعالیٰ کو پسند آگئی ہے اور اس نے پرویز کی شکل میں مجھے انعام سے نوازا ہے۔

کتنی بھولی تھی میں بھی.....!

شاید اس ہوٹل کے بیرے پرویز کو پہلے سے جانتے تھے کیونکہ جہاں جہاں وہ گزرتا وہ مؤدب کھڑے ہو کر سلام کرتے تھے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ پرویز کوئی غیر معمولی شخصیت کا حامل ہے اور میرے تصورات سے بھی بڑا آدمی ہے۔ اس رات اس شاندار ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے پرویز نے بڑے جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر میرے لئے جینے مرنے کا عہد کر لیا۔ اس نے مجھ سے نوکری چھوڑ دینے کو کہا۔

"کیوں؟" میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

"محترمہ! میں نے یہی خوش خبری سنانے کے لئے تو آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔ کہ میری کمپنی نے آپ کا انتخاب کر لیا ہے۔ باضابطہ اطلاع بھی آپ کو جلد ہی مل جائے گی۔"

"آپ کا شکریہ لیکن باضابطہ اطلاع سے پہلے شاید میرے لئے یہ ممکن نہ ہو۔" میرا لہجہ گو کہ غیر سنجیدہ تھا لیکن پرویز کچھ اداس سا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی سے اپنی بات منوانے کی عادت ڈال دی"۔

اس نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہا کہ شرم سے دوہری ہو گئی۔

واپسی پر وہ مجھے اسی کار میں چھوڑنے ہوسٹل تک آیا۔ اس نے میرے روکتے روکتے بھی کار ہوسٹل کے دروازے کے سامنے لا کر کھڑی کی تھی گو کہ یہاں ایسی کاروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن مجھ ایسی نرس کو ایسی کار سے اترتے دیکھ کر گیٹ پر موجود چوکیدار کا چونک جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

○

صبح میں نے چھٹی کی درخواست گزاری اور اس موقع کو غنیمت جان کر عابدہ سے ملنے چلی گئی۔

عابدہ کے گھر میں دو گھنٹے کے بعد ہی پہنچ گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر جس شخصیت نے پٹ کھولے اسے دیکھتے

ہی مجھے میری دادی یاد آ گئی۔ ایک باوقار اور تقدس اس بوڑھی عورت کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔

"مجھے عابدہ سے ملنا ہے"۔ میں نے سلام کر کے اسے کہا۔

"آؤ بیٹی آؤ! میں تو تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم نجمہ ہو کتنے دنوں سے بے چاری تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔

انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ مکان گو کہ چھوٹا تھا لیکن اس امر کا منہ بولتا ثبوت کہ اس کے مکین بڑے ظرف اور دل کے مالک ہیں۔ مجھے ایک سادگی سے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس تقدس مآب ہستی نے عابدہ کو آواز دی جو شاید ابھی تک میری آمد سے بے خبر تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھے دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اچانک خوشی اور حیرت سے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ پھر بے اختیار اس کی باہیں پھیل گئیں۔

"باجی!" وہ مسرت بھرے رندھے ہوئے گلے سے چلائی اور میرے کلیجے میں سما گئی۔

"آپ نے اتنی دیر کر دی باجی! آپ نے..... آپ نے....." بے ربط سے جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اس کی جذباتی کیفیت اور موقعے کی مناسبت سے بزرگ خاتون نے ہمیں اکیلے چھوڑ دینے ہی میں مصلحت جانی۔

"اچھا بیٹا! میں ذرا اشفاق کو اطلاع کرواتی ہوں"۔ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

○

دو تین منٹ تک تو ہم دونوں نے سوائے روتے کے اور کچھ نہ کیا پھر مجھے ہی ہوش آیا۔ میں نے اسے "نئی زندگی" کی مبارکباد دے کر اس کی خوش بختی پر نعرہ تحسین الاپا۔ اسے اچھے مستقبل کی دعائیں دیں اور اپنے دیر سے آنے کی وضاحت بھی کر دی۔

"مجھے کسی کا ڈر نہیں باجی! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا..... بس یونہی ابھی بطور احتیاط امی سے نہیں مل رہی میں نہیں چاہتی کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ ورنہ "ان" کی طرف سے تو مجھے ملنے کی پوری پوری اجازت ہے....."

اس کی بات ابھی مکمل ہی ہوئی تھی کہ اس کا "ان" بھی آ گیا۔

"سلام علیکم باجی! اشفاق نام ہے میرا"۔

ایک دراز قد کھلتے ہوئے رنگ اور تیکھے نقوش والے نوجوان نے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی خاندانی شرافت اس کے لفظوں اور چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ واقعی عابدہ خوش قسمت تھی۔

"عابدہ نے میرا تعارف تو کروا دیا ہو گا۔ لیکن میں نے پھر بھی یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی سب کچھ کہہ دوں"۔

اس نے ہمارے چہروں سے ماحول کی سنجیدگی کا اندازہ لگاتے ہوئے بظاہر اس سنگین سنجیدگی سے نجات کی راہ اپنائی۔ دو قدم آگے بڑھ کر وہ جھک گیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ابھی بمشکل ایک دو دعائیہ کلمات ہی کہے تھے کہ دل بھر آیا اور میں بے اختیار سسک پڑی۔

"ارے واہ! ابھی یہ خوش ہونے کا کون سا طریقہ ہے"..... اس نے پھر موقعہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

"خوشی کے آنسو ہیں بھائی! اللہ تم دونوں کو نظر بد سے بچائے"..... بالآخر میں نے خود پر قابو پا لیا۔

اشفاق میں عام نوجوانوں والی کوئی بھی بات مجھے نظر نہ آئی۔ اس کی عمر جتنی کم تھی گفتگو اتنی ہی سنجیدہ۔ اس نے مجھے ایک ہی بات کہی کہ عابدہ کے ساتھ اس کی شادی کوئی جذباتی فیصلہ نہیں۔ اس نے سوچ سمجھ کر حالات کا جائزہ لے کر اور اپنے والدین کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہے۔

خود عابدہ جتنی مطمئن تھی اور اس کے چہرے سے جس طمانیت اور سکون کا احساس ہو رہا تھا، اس کے بعد تو کوئی وجہ ہی نہیں تھی کہ میں اس کی ازدواجی زندگی کے متعلق پریشان ہوتی۔

اشفاق کے والدین نے بھی مجھے مطمئن کر دیا۔ میں اپنی بہن کے لئے کچھ تحائف لے گئی تھی، وہ اس کی نذر کر دیئے۔ پھر اسے اپنے باہر جانے کی اطلاع بھی دے دی۔ اس خبر نے عابدہ کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔

"باجی! اپنوں میں ایک آپ ہی تو تھیں جن سے مل سکتی ہوں۔ اب آپ بھی چلی جائیں گی تو میں....."

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گئی۔

شام کو ہم دونوں بہنیں جدا ہو گئیں۔ میرے "ناں ناں" کرنے کے باوجود اشفاق مجھے بس اڈے تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے روانگی کے وقت پھر مجھے یہی کہا تھا۔

"باجی! اپنے دل پر کوئی بوجھ لے کر نہ جانا۔ مجھے عابدہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر زندگی میں کبھی میرے ہوتے ہوئے آپ کو بھائی کی کمی کا احساس ہوا تو میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا"۔

میں خاموش رہی۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات چھپی تھی کہ اس کی ہر بات سچ معلوم پڑتی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ نوجوان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ضرور کر کے دکھا دے گا۔ عابدہ سے ملاقات کے لئے میں نے ایک روز کی رخصت لی تھی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ میری ماں اور اس شیطان کو جوان کا گورو گھنٹال تھا۔ اس بات کی خبر نہ ہو۔ میں نے تو پرویز کو بھی کانوں کان اس واقعے کی اطلاع نہیں ہونے دی تھی۔ پرویز کو میں نے وقتی سہارا جان کر ضرور قبول کیا تھا لیکن وہ آصف کی طرح میرا محبوب نہ بن سکا۔ جس طرح میں نے آصف کو اور آصف نے مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا یوں کوئی کسی کو چاہے گا۔

اس محبت میں ایک تقدس تھا

اپنائیت تھی.....

تقاضا تھا

یہاں شاید مجبوری کارفرما تھی۔ گو کہ میرے شعور میں دور تک یہ بات موجود نہیں تھی کہ میں نے پرویز کو اپنی مجبوری جان کر قبول کر لیا ہے لیکن میں جانتی تھی کہ خود کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ جب کبھی تنہائیوں میں میں نے آصف کا موازنہ پرویز سے کرنا چاہا۔ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا... !

وہ لازوال تھا... !

وہ زندگی کے ساز پر گایا جانے والا امر گیت تھا۔ ایسا امر گیت جو جب بھی جس موسم میں بھی گایا جائے زندگی بخش ہوتا ہے۔

میں نے اپنی دانست میں آصف سے جدائی اختیار کر کے بہت بڑی قربانی دی تھی لیکن افسوس میں نے اپنے ظرف سے بڑا قدم اٹھا لیا تھا آصف کو کھو دینے کا پچھتاوا اب میری جان کو آنے لگا تھا۔ خصوصاً عابدہ کے شوہر سے ملاقات کے بعد سے میں آصف کو بہت "مس" کرنے لگی تھی...!!

یہی وہ کمزوری تھی جس کے ہاتھوں میں پرویز کے سامنے انکسبلانٹ ہوئی۔ مرتے ہوئے انسان کو چند لمحوں کے لئے تیمارداری کرنے والا بھی "مسیحا" نظر آتا ہے۔ میں نے شاید پرویز کو ایسا مسیحا جان کر قبول کر لیا تھا جو میرے اندر بپا حشر کی شدت کو کچھ کم کر سکے... میرے درد کا کوئی مداوا کر سکے۔

○

ملاقات کے تیسرے ہی روز فرم کی طرف سے تین ہزار روپے کا ڈرافٹ اور ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "مجھے منتخب کر لیا گیا ہے اور اب مجھے تین مہینے کراچی میں "خصوصی ٹریننگ" دینے کے بعد باہر بھیجا جائے گا اور ٹریننگ کے اخراجات میری کمپنی برداشت کرے گی"۔

میری ماں کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ یہ تو پرویز پر مرنے جا رہی تھی۔ شام کو پرویز خود چلا آیا۔ اس نے آتے ہی مجھے مبارکباد دی۔ اس نے میری ماں کے سامنے ہی مجھے دو شاندار ساڑھیاں تحفہ دیں۔ میری ماں نے اس بات کو بھی اپنی خوش قسمتی جانا کہ اتنا بڑا آدمی میرا "عاشق" ہے۔

کچھ لوگ زندگی بھر تجربے کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کی زندگیاں تجربات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ میرا شمار دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ پیدائش سے اب تک زندگی نے مجھے جی بھر کر آزمایا اور ٹھونک بجا کر پرکھا ہے۔ نجانے مجھ میں سے اسے کیا حاصل کرنا تھا۔ آصف سے محبت کے جس تلخ تجربے سے میں گزری تھی اور خود کو تج کر جس طرح اس کا خراج ادا کر رہی تھی اس کے بعد بظاہر یہ ناممکن تھا کہ میں دوبارہ اس وادی پُرخار میں اتروں گی اور وہ بھی اس حالت میں کہ میرے تلووں سے لہو رس رہا ہو گا۔

لیکن... !

آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خلا جو بچپن ہی سے میری زندگی میں پیدا ہو چکا تھا اسے چونکہ محبت ہی سے پُر ہونا تھا لہٰذا ہر جگہ میں نے اس محبت کے نام پر کبھی فریب کھایا اور کبھی خود کو فریب دیا۔ میری حالت اس وقت تک اس ندیدہ بچے کی سی تھی جو ہر چمکتی شے کو سونا سمجھ کر اس کی طرف لپکے اور اپنے ہاتھ جلا بیٹھے۔

پرویز سے ملنے کے بعد میں نے آصف کو بھلایا نہیں تھا۔ جو لوگ زندگی کا حصہ بن جائیں وہ خود سے لاکھ جھٹکنے کے بعد بھی الگ نہیں کئے جا سکتے۔ بس اتنا ہوا کہ میرے اندر دہکتے ہوئے الاؤ پر ایک دفعہ تو منوں ریت گر پڑی جس نے ان شعلوں کو جو مجھے بھسم کرنے پر تلے ہوئے تھے کسی حد تک اس ریت تلے دبا دیا۔

پرویز سے ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ اس کی جگہ اگر اور بھی کوئی اس جیسا نوجوان ہوتا تو ضرور اسے میرے والدین کی آشیرواد حاصل ہو جاتی۔ اس کی تو بات ہی اور تھی۔ میری ماں کو تو اس کی آمد کا انتظار رہتا تھا۔

عابدہ کے تجربے سے میں نے یہی سیکھا تھا کہ عورت اکیلی زندگی کی لڑائی نہیں لڑ سکتی۔ اسے ایک مضبوط سہارے کی تلاش رہتی ہے۔ اشفاق کی شکل میں اسے ایک سائبان میسر آ گیا تھا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ حالات کی کڑی اور جان توڑ دھوپ سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ اور مجھے اپنا گھر بنانا تھا...!

بظاہر تو میں بڑی بہادر بنے نکلی تھی لیکن میری فطرت میں سمائی بزدلی کے سامنے مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ عابدہ سے ملنے کے بعد میری سوچ نے ایک نیا رخ اپنانا شروع کر دیا تھا۔ پرویز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے میرا انتخاب بیوی بنانے کے لئے کیا ہے اور ہم شادی کے بعد مستقل یورپ میں آباد ہو جائیں گے... اور میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اس طرح میں اپنے والدین کے شر سے اور آصف کا سامنا کرنے سے زندگی بھر کے لئے بچ جاؤں گی۔

میں نے کہا ناں... کہ انسان کچھ کرنے پر تل جائے تو غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلائل بھی خود ہی تلاش کر لیتا ہے۔

○

پرویز سے ملاقاتیں اور سیر سپاٹے روزانہ کا معمول تھا۔ ہر نئی ملاقات پر وہ مجھے مستقبل کی ایسی سہانی اور دلفریب تصویر دکھاتا کہ میں اس کی دلدل میں گہری سے گہری اترتی چلی جاتی۔ نوکری سے میں نے اس کے بضد ہونے پر استعفیٰ دے دیا تھا۔

آج سوچتی ہوں کہ اس کی وجہ بھی یقیناً یہی ہوئی کہ اس طرح اس کے نزدیک میرے "ارادہ بدلنے" کے امکانات بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتے۔

پرویز کے دفتر میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس دوران میں نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی کہ اس کے اعلیٰ عہدے یا کسی اور وجہ سے کسی نے میری طرف کبھی غلط نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک اس کا اسسٹنٹ نوید

ضرور ایسا تھا جو کبھی کبھی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا لیکن میری نظروں کا سامنا کرنے سے ہچکچاتا تھا۔

اس روز بھی جب میں پرویز سے اچانک ملنے پہنچی تو وہ شاید کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اس کا اسسٹنٹ نوید اس کے کمرے میں ایک فائل پر جھکا ہوا تھا۔

"تشریف رکھیے" ..... آج پہلی مرتبہ اس نے مجھے مخاطب کرنے کی ہمت کی تھی۔ اس کے لہجے میں نجانے ایسی کیا بات تھی کہ مجھے بے اختیار اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ ایش ٹرے میں سلگتے سگریٹ کا لمبا کش لے کر اس نے دھوئیں کے مرغولے بنائے اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"نجمہ بی بی! مجھے آپ سے بات کرنے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ یوں بھی میں کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن پچھلے پندرہ بیس دنوں سے میں جب بھی آپ کو دیکھتا ہوں ایک نادیدہ طاقت مجھے مجبور کرنے لگتی ہے کہ میں آپ کو حقائق سے ضرور آگاہ کروں ..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے اس ہمدردی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی"۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ..... میں الجھنے لگی تھی۔

"میں اتنے برے انسانوں میں رہتا ہوں مس نجمہ! کہ جہاں اپنی ماں بہن کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن میں آپ کو اپنی بہن سمجھ کر یہ بات بتا رہا ہوں کہ آپ بہت بھولی ہیں۔ آپ ایک گہرے دلدل میں پھنسنے جا رہی ہیں۔ ایک جال آپ کے گرد بُنا جا رہا ہے۔ اس میں سے اب بھی وقت ہے کہ نکل جائیے"۔

اس کی آواز بڑی دھیمی تھی۔ شاید اسے اس بات کا خوف تھا کہ دیواریں ہی اس کی آواز نہ سن لیں۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ..... مجھے اس کی جرأت پر غصہ آنے لگا تھا۔

"میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں مس نجمہ! میں نے کہا ناں کہ میں کبھی اچھا آدمی نہیں رہا۔ میں نے کبھی کسی کو خبردار نہیں کیا ..... لیکن کوئی نادیدہ طاقت مجھے بار بار مجبور کر رہی ہے کہ میں آپ کو اس دلدل میں گرنے سے روک لوں ..... جس میں آپ ڈوبنے جا رہی ہیں"۔

"میں نے کہا ناں ..... کھل کر بات کرو" ..... مجھے الجھن سی ہونے لگی تھی۔

"آپ سمجھ دار ہیں۔ پگلی نہیں نہ ہی میں کسی اجنبی زبان میں گفتگو کر رہا ہوں۔ مس نجمہ! یہ لوگ بہت برے ہیں۔ یہ انسانوں کے روپ میں درندے ہیں ..... درندے ..... یہ بھیڑیے ہیں جو ہر کمزور بھیڑ کا خون پینے پر تلے رہتے ہیں ..... آپ کو کسی نے ٹریننگ کے لئے منتخب نہیں کیا۔ آپ کو جسم فروشی کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔"

"بکو مت!" ..... میں نے قریباً چیختے ہوئے کہا۔

چلاؤ مت۔ میری بات سن لو ..... میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ نیک کام کرنے کی جرأت کی ہے ..... مجھے تو اس کی جو سزا ملے گی ..... بدلہ لوں گا ..... "ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ شاید اپنے

اعصاب کو نارمل کر رہا تھا۔

"لیکن تم یاد رکھنا۔ نادان لڑکی! اگر تم ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی تو تمہارا انجام اتنا برا ہو گا جس کے تصور ہی سے خوف آ جائے۔ یہ لوگ تم کو اس حال میں پہنچا دیں گے کہ تم مرنا چاہو گی اور مر نہیں سکو گی۔

موت بھی تم پر مہربان نہیں ہو گی مس نجمہ!"

اس نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اس لئے یہ کمبخت مجھے گھور گھور کر دیکھا کرتا تھا۔ اب ایک مقدس رشتے کی آڑ میں میرے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل کھیلنا چاہتا ہے"۔ میں نے سوچا۔

"حاسد" ..... اس کے متعلق ایک ہی لفظ میرے ذہن میں ابھرا اور میں پھٹ پڑی

"بکواس بند کرو ..... خبردار اگر آئندہ کبھی مجھ سے بات بھی کرنے کی ہمت کی ....." میں غصے سے کانپتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی۔

ابھی میں نے گیٹ سے پاؤں ہی باہر نکالا تھا کہ پرویز کی گاڑی وہاں اچانک آ کر رکی۔

"نجمہ تم ....." اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ میری آنکھوں میں اسے دیکھ کر نجانے کیوں نمی سی تیرنے لگی تھی۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے نا؟" ..... اس نے گھبرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میرے آنسو نکل پڑے۔ اس سے کچھ کہہ نہ سکی۔

"آؤ آؤ اندر چلتے ہیں"۔

"نہیں پرویز! تمہارے دفتر میں نہیں، کہیں اور چلتے ہیں" ..... میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا بھئی لیکن خدا کے لئے رونا نہ شروع کر دینا"۔ اس نے اگلا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔

ہم دونوں تھوڑی دیر بعد ایک شاندار ہوٹل کے "گوشہ عافیت" میں ایک دوسرے کے سامنے چائے کی پیالیاں پکڑے بیٹھے تھے۔ میں نے اسے نوید کی حرکت سے آگاہ کر دیا تھا۔

"اس کتے کی یہ مجال کہ تمہارے منہ لگے۔ حاسد، کمینہ" .....

پرویز نے اسے ایک ہی سانس میں نجانے کتنی اخلاقی گالیوں سے نواز دیا۔ اس کے چہرے کی رنگت غصے سے بدلنے لگی تھی اور اعصاب کھنچ کر تن گئے تھے۔

"اس کتے کے پلے کو میں نے نالی کے کنارے سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا ہے اور یہ ....." اس نے دانت پیستے ہوئے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"چھوڑو بھی... میں نے تو پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا" میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لئے کہا۔
اور اس کا موڈ بالکل نارمل ہو گیا۔

(۶)

چند روز کے بعد میں پرویز کے ہمراہ کراچی جا رہی تھی۔ ہوائی جہاز کا سفر' شاندار ساز و سامان' پرس میں بے شمار نوٹ اور ایک خوبصورت نوجوان دولت مند کا ساتھ۔

میرا دماغ جہاز کے ساتھ ساتھ عرش پر پرواز کر رہا تھا۔ جہاز کے سفر کے دوران میں پرویز نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ تین مہینے کا تو بہانہ ہی کیا ہے۔ بس تین چار ماہ کے بعد اس کا تبادلہ بھی باہر ہو رہا ہے جہاں ہم دونوں اکٹھے ہی جائیں گے اور میرے بھٹکے ہوئے ذہن نے اس کی اس بات کو بھی قبول کر لیا۔ میں دل ہی دل میں مستقبل کے منصوبے بنانے لگی۔

"نجمہ! ہم مڈل ایسٹ پہنچتے ہی شادی کر لیں گے"۔

اس نے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہی خوشخبری سنا دی اور میں جھوم ہی تو اٹھی۔ کراچی میں ہمارا قیام ایک بنگلے میں ہوا جو شاید اس فرم نے اسی خاص مقصد کے لئے رکھا تھا۔ جس کی بہتی چڑھنے میں جا رہی تھی۔ یہ بنگلہ صرف فرم کے افسران کے لئے تھا لیکن پرویز نے "خصوصی طور" سے اسے میرے لئے "ریزرو" کروایا تھا۔ ٹریننگ کا تو بہانہ ہی تھا۔ بس صبح دو تین گھنٹے کے لئے مجھے ایک ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا جس نے اس بڑے شہر میں جدید انداز کا کلینک کھول رکھا تھا۔

وہ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ مڈل ایسٹ میں ہسپتال وغیرہ کے اوقات اور وہاں کام کرنے کے طور طریقے کیا ہیں۔ مجھے وہاں پرویز ہی چھوڑنے جاتا اور وہی لے کر واپس آیا کرتا تھا۔

ہماری شامیں سمندر کے کنارے اور راتیں شاندار ہوٹلوں میں بسر ہوتیں۔ سونے کے لئے ہم اسی بنگلے میں آ جاتے جس کا ایک علیحدہ کمرہ میرے لئے مخصوص تھا۔ کیا مجال جو کبھی اس نے یہاں داخل ہونے کے بعد دروازہ بھی کھٹکھٹانے کی جرات کی ہو۔ وہ میرا اعتماد' بھرپور اعتماد حاصل کر رہا تھا اور اس میں صد فی صد اسے کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔

وہ رات جس نے میری سیاہ بختیوں پر مہر تصدیق ثبت کی ویسی ہی راتوں جیسی ایک تھی جو میں اور پرویز پہلے ہی سے بسر کر رہے تھے۔ اس کا رویہ بھی کوئی غیر معمولی نہ تھا یا اگر کوئی ایسی بات تھی تو اس نے مجھے اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔

کمال کا اداکار تھا وہ ظالم.....

ہم دونوں اس رات انگریزی فلم کا آخری شو دیکھ کر لوٹے تھے۔ اس فلم نے میرے جذبات میں خاصی ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ فلم کا کمال تو یہ نہیں تھا۔ بس یوں جان لیجئے کہ یہ اوقات انسانی محسوسات پر ایک خاص کیفیت عائد ہو کر اسے کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ ہماری واپسی پر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔

"آؤ ایک کپ کافی کا ہی تمہارے ہاتھ سے پی لیں" ..... پرویز نے بڑی بے تکلفی سے میری کمر کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اکٹھے ہی کچن میں پہنچے تھے۔ یہاں کا ملازم میرو آج شاید چھٹی پر چلا گیا تھا۔ کافی کے دو مگ تھام کر ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ خلاف توقع آج پرویز بالکل میرے ساتھ چمٹ کر بیٹھا تھا۔ پچھلے دنوں ہی میں پرویز نے مجھے جن جہانوں سے آشنائی بہم پہنچائی تھی اس کے بعد میرے لئے اس کی یہ حرکت کوئی ایسی غیر معمولی نہیں تھی کہ میں اس کا نوٹس لیتی۔ اس لمحے میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی گذشتہ محرومیوں کا رونا رو کر میری محبت کو اپنی کائنات کا حاصل بتایا۔ اس دوران اس کی دراز دستی بھی جاری رہی۔ پھر وہ مرحلہ بھی آیا جب اس نے میرے "لب لعلیں" کی خوشبو چرالی مجھ پر ایک مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ شاید اس رات میرے اندر کی نجمہ مر گئی تھی۔ وہ نجمہ جسے میں نے ماکھے شاہ اور اس کی مریدنی کی میلی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔

وہ نجمہ جس نے صرف عزت بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ آج وہ شاید میرے اندر ہی کہیں مر گئی تھی۔ اس میں سے میری ماں نے جنم لے لیا تھا۔ آج میں زہراں کی بیٹی بن گئی تھی۔

اس عالم نے مجھے تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ ہم دونوں اس گھناؤنے عمل سے گزر گئے جس کے بعد پاکیزگی اور تقدس کی سربکف عمارتیں ریت کے قلعوں کی طرح گرنے لگتی ہیں۔ اپنے کنوارپن اور نسوانی تقدس کا خون میں نے اپنے ہاتھوں کیا تھا۔

نسوانی عظمت کی عظیم اور نازک سرحد کا یوں اچانک گر جانا کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ مجھے ایسی لڑکیوں کو اس حادثہ جانکاہ کے بعد مر جانا چاہئے لیکن تب تک میرے زندہ رہنے کا جواز یہی تھا کہ مجھے اپنے "لٹ جانے" کا احساس نہیں ہونے دیا تھا پرویز نے۔

ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے پرویز نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ اس حادثے پر اظہار افسوس و ندامت کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ شرمندہ میں تھی کہ میں خود کو اس المیے کا اس سے زیادہ ذمہ دار گردانتی تھی۔

کچھ بھی ہو بہرحال اس میں میری رضامندی بھی شامل تھی۔ اور یہی اس شاطر کا کمال تھا۔ اس نے مجھ سے ایسی لڑکی سے گناہ بھی کروایا تو اس ڈھنگ سے کہ خود میں ہی خود کو گناہگار جاننے لگی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ لٹی بھی میں ہی تھی اور الزام میں خود کو دے رہی تھی۔ ..... اس جیسا شیطان میں نے دوبارہ زندگی میں نہیں دیکھا۔

میں نے زندگی کتابوں میں نہیں پڑھی خود پر وارد کر کے بتائی ہے۔ تعلیم نے معاشرے نے مجھے یہی بتایا اور سکھایا تھا کہ لڑکی تب تک تقدس مآب ہے جب تک وہ باکردار ہے ورنہ وہ عورت کے منصب سے گر کر فاحشہ بن جاتی ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ جب تک میں فاحشاؤں میں رہی خود کو باکردار رکھا' اپنی عصمت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی' عورت کی سطح سے اتر کر مردانگی اپنائی اور مارشل آرٹس اس لیے سیکھنے چل دی کہ مجھے اپنی ماں اور اس کے گرد گھنٹال ماکھے شاہ کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ لوگ مجھے زبردستی اپنے راستے پر چلنے کو کہیں گے۔

لیکن آج.....

میں نے اپنے ہاتھوں اپنی رضامندی سے اپنی پاکیزگی کا خون کر دیا۔

میں نے بمشکل خود کو سمیٹا' اپنے ڈگمگاتے وجود کو سنبھالا اور باتھ روم کا رخ کیا۔ وہ رات کروٹوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ساری رات ایک ناکام خلش' اک پچھتاوہ' اک احساس گناہ مجھے ڈستا رہا۔ میں کمزور لمحوں کی گرفت میں سسکتی اور آنسو بہاتی رہی۔ آصف کئی مرتبہ سلگتا سوال بن کر میرے ذہن سے چپکا۔ اس نے مجھ سے کئی سوال کیے' کئی باتیں یاد دلائیں۔ اس سے کیے وعدوں کی یاد دلائی۔

اور میں..... بے بسی سے اپنا تکیہ آنسوؤں سے گیلا کرتی رہی۔ اس رات کم از کم یہ ضرور ہوا کہ آصف سے ملنے کی اگر کوئی خواہش میرے لاشعور میں ابھی چنگاری کی طرح سلگ رہی تھی تو راکھ ہو گئی۔ میں نے اپنا تجزیہ کیا اور ایمانداری سے یہی فیصلہ کیا کہ اب تو کم از کم تمام حجت کے لیے بھی کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

علی الصباح پرویز نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار معافی مانگ رہا تھا۔ مجھ سے نارمل ہونے کی التجا کر رہا تھا۔ پھر مجھے اس لیے بھی "نارمل" ہونا پڑا کہ اچھا ہوا اگر میرا کوئی آسرا تھا تو یہی پرویز تھا۔

میں تربیت یافتہ نرس تھی جلد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے

کچھ خدشات نے میرے ذہن میں سر ابھارا، لیکن پرویز نے اس بات کو ہنسی مذاق میں اڑا دیا۔

"تم تو خواہ مخواہ گھبرا گئی ہو بھئی کہ۔ جو دیا کہ بس تین ماہ کے اندر ہم باقاعدہ شادی کر لیں گے"۔ مجھ میں تمہیں رکھ کر نہیں لے جانا چاہتا۔ میں تو تمہیں دلہن بنا کر اپنے بزرگوں کی اجازت سے لے کر جاؤں گا"۔

اور میں مطمئن ہو گئی۔ اس بات کا ذکر میں نے کسی سے نہ کیا۔ دو ماہ کے بعد ہی میرا ویزا آ گیا۔ میرے ہمراہ دو اور لڑکیاں بھی جا رہی تھیں اور ہم سب کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں نرسنگ کے فرائض ادا کرنے تھے۔

کراچی سے واپسی پر میں اپنے گھر والوں کے لئے بے شمار تحائف خرید کر لائی تھی۔ ان کو تو یہی کچھ چاہئے تھا۔ انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میری عظمت کے گن گانے لگے۔

ہوائی اڈے پر مجھے رخصت کرنے کے لئے پرویز بھی موجود تھا۔ میری دونوں ساتھی لڑکیاں میرے لئے اجنبی تھیں۔ ان کو غالباً کسی دوسرے شہر سے شکار کیا گیا تھا۔ میرا اور ان کا تعارف بھی ہوائی جہاز ہی میں ہوا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی تو ہوئی کہ وہ دونوں مجھ سے کیا ایک دوسری سے بھی کھنچی کھنچی تھیں جیسے ان کو کسی نے خاص طور پر اپنے متعلق کچھ نہ بتانے کی ہدایت کی تھی۔ پرویز نے جاتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ وہ جلد ہی وہاں پہنچ جائے گا۔ اس اثناء میں اسے اپنے بزرگوں سے بھی شادی کی اجازت مل جائے گی۔ میں مطمئن ہو کر ایک شاندار مستقبل کی امید لئے مڈل ایسٹ جا رہی تھی۔

ہوائی اڈے پر ہمیں لینے کے لئے کسی ہسپتال کی نہیں ایک عرب شیخ کی شاندار کار آئی تھی اور اس میں بیٹھتے ہوئے میری طرح دوسری لڑکیوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ آخر کیا چکر ہے؟ ہم کسی ہسپتال کی ملازم ہو کر آئی ہیں یا کسی شیخ کی؟ کار کا ڈرائیور کوئی عربی تھا۔ ہوائی اڈے پر ہمارا استقبال ایک پاکستانی نے کیا جس کی شکل ہی سے خباثت ٹپکتی تھی۔ اس نے ہمیں اس طرح للچائی نظروں سے دیکھا جیسے وہ ہمیں کھا ہی جائے گا۔

ہم تینوں کو ایک خوبصورت اور جدید طرز کی بنی ہوئی کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ میں اسے محل ہی کہوں گی۔ اس محل میں پہلے سے بے شمار کمرے سجائے گئے تھے۔ ہمارا استقبال ایک غیر ملکی خاتون نے مسکراتے ہوئے کیا۔ عمارت کے باہر نصب بورڈ پر "بورڈنگ ہاؤس" تحریر تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور سے نوٹ کی کہ ہوائی اڈے سے یہاں پہنچنے تک ہمیں جتنے لوگوں سے بھی پالا پڑا انہوں نے ہمیں بالکل بیوپاریوں جیسی نظروں سے دیکھا تھا۔ ہوسٹل میں ہمیں سب سے اوپر منزل پر الگ الگ کمرے الاٹ کئے گئے اور وہ بوڑھی خرافہ ہماری انچارج تھی۔

وہ رات میں نے ڈرتے "ڈرتے گزاری۔ یہاں دوسرے ممالک کی بھی دس بارہ لڑکیاں رہائش پذیر تھیں۔ لیکن میں نے وہاں کسی کو بھی ضرورت کے بغیر ایک دوسرے سے بات کرتے نہ پایا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انہیں سختی سے ایک دوسرے سے بولنے کی ممانعت کی گئی ہو۔

مجھے کھانا کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔ صبح کے وقت ایک ویگن میں جس پر ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا مجھے ایک پرائیویٹ ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اسے ہسپتال تو نہیں کہوں گی۔ ایک ڈاکٹر کی دکان ہی سمجھیں جس میں شاید دو تین مریضوں کے داخلے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہاں ہی پاکستانی مرد نے جو مجھے ہوائی اڈے پر لینے آیا تھا بتایا کہ مجھے روزانہ چھ گھنٹے کام کرنا پڑے گا اور شام کے وقت گاڑی ہوسٹل چھوڑ آیا کرے گی جہاں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اس کی حیا سوز بے باک نظروں سے تو میں بری طرح خوفزدہ ہو گئی۔ پھر میں نے تمام ڈر اور خوف کو دل سے نکال باہر پھینکا۔ ظاہر ہے کمپنی ہی ہماری رہائش کی ذمہ دار تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کا بندوبست بھی کر دیا تھا اور کام بھی بتا دیا تھا۔ میں نے پہلا خط ہسپتال ہی سے گھر لکھا جس میں گھر والوں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب ان کا پیسہ خواب پورا ہو جائے گا اور میں ان کو جلد ہی "باہر کا مال" بھیجنا شروع کر دوں گی۔ شام کو مجھے وہی ویگن واپس ہوسٹل لے آئی۔

پانچ چھ روز اسی طرح گذر گئے۔ ایک روز میں نے انچارج خرافہ سے پرویز کے متعلق پوچھا تو اس نے بڑی مکاری سے مسکرا کر بڑے فحش لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"آ جائے گا تنی بے چینی بھی کیا؟"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں لیکن یہاں آنے سے پہلے پرویز نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہاں کا ماحول بڑا آزاد ہے گھبرانا نہیں بلکہ خود کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنا۔ کاش میں نے اس کی کسی بات کو تو سمجھ لیا ہوتا۔!!

میں چپ چپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ شام کو اسی خرافہ نے مجھ سے پوچھا کہ "پاکستان کوئی ڈاک تو نہیں بھیجنی؟"۔!!

میں نے جواب نفی میں دیا۔

"گھر خط بھی نہیں لکھنا کیا؟"

"لکھ دیا ہے"۔ میں نے مختصراً لیکن قدرے غصے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جلدی سمجھ جاؤ گی۔ بڑی دیکھی ہیں تم جیسی۔" اس نے جاتے جاتے کہا۔

اگلے روز چھٹی تھی۔ سر شام ہی لڑکیوں نے خود کو بناؤ سنوارنا شروع کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہمارے نرسنگ ہوسٹل کی طرح یہاں بھی کاریں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کار دروازے پر رکتی اور ایک بنی سنوری لڑکی کار میں آنے والے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ چلی جاتی۔

"یا اللہ میں کس عذاب میں پھنس گئی ہوں" میں نے سوچا۔

پھر خیال آیا کہ یہ سب کچھ کہاں نہیں ہوتا۔ ہر انسان کا اپنا کردار ہوتا ہے پھر یہ سب کچھ آخر پہلی مرتبہ تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایسے مناظر دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اگر میں وہاں محفوظ رہی ہوں تو یہاں بھی رہوں گی۔ بہرحال اپنے کردار کو ٹھیک رکھنا اپنے بس میں ہوتا ہے۔ کوئی لٹھ لے کر تو میرے پیچھے نہیں گھوم رہا۔ پھر مجھے اس بات کا یقین بھی تھا کہ جلد ہی پرویز آ جائے گا اور ہم شادی کر لیں گے۔

پرویز واقعی اسی روز رات کی فلائٹ سے آ گیا اور آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے بغیر اس نے بڑی مشکل سے یہ ہفتہ گزارا ہے۔

میں نے اپنے پیٹ میں پلنے والے گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب اس سے بزرگوں کے فیصلے کے متعلق پوچھا تو اس نے ہنس کر بات ہی اڑا دی۔

"تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں آئی بیوقوف!"

"کیا؟" ..... میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ واقعی مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو جانے دو کہیں سیر کرنے چلتے ہیں"۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ ہم دونوں ایک شاندار کار میں بیٹھ کر پرویز کے ایک دوست کے گھر روانہ ہو گئے۔ سارے راستے وہ مجھے بتاتا رہا کہ جو لڑکیاں یہاں ذرا سی "آزاد" ہو جاتی ہیں وہ کتنی شاندار زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے لہجے میں وہی ترغیب دلانے کا انداز تھا۔ جو پیشہ ور دلالوں کی گفتگو میں ہوتا ہے۔ آج سوچتی ہوں تو اپنی سادگی پر خود ہی مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اس وقت بھی اس کی نیت پر شک نہ کیا۔

میں نے یہی سوچا آخر پرویز کا آنا جانا یہاں لگا رہتا ہے۔ یوں بھی اس کا تعلق اونچی سوسائٹی سے ہے جہاں آزاد خیالی کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اس نے چونکہ ماحول ہی مخلوط اور مادر پدر آزاد دیکھا تھا۔ اس لئے اسے میری حد سے زیادہ شرم و حیا کھلنے لگی تھی۔ !! ممکن ہے وہ مجھ سے وہی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہو جو ایک اونچی اور مخلوط سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والے مرد کو اپنی بیوی سے وابستہ کرنی چاہئیں۔

میں خاموش ہو رہی۔

صحرا کے بیچوں بیچ ہی سڑک پر چلتی ہوئی شاندار کار بالآخر ایک جدید طرز تعمیر کی حامل کوٹھی کے سامنے جا کر رک گئی۔

پرویز کا دوست ایک پاکستانی سرمایہ دار تھا۔ جس کی عمر کم از کم میرے والد کے برابر تھی۔ اس شخص کا شمار یہاں کے متمول لوگوں میں ہوتا تھا اس کو اس ملک کے اعلیٰ حلقوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مقامی شیوخ سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان ساری باتوں کا علم مجھے راستے ہی میں ہو گیا تھا۔ پرویز نے تو مجھے یہ سب کچھ کسی اور ہی نقطہ نظر سے بتایا تھا۔ لیکن میری بے وقوفی کا اندازہ فرمائیے کہ میں دل ہی دل میں اس بات سے مرعوب ہو رہی

تھی کہ میرے محبوب کے تعلقات کتنے بڑے بڑے لوگوں سے ہیں۔

اس شخص نے بڑی فراخدلی سے ہمارا استقبال کیا اور مجھ سے زبردستی مصافحہ بھی کر لیا۔ پرویز نے مجھے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ مجھے یہاں آ کر مغربی طور طریقے اپنانا ہوں گے اور ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا ہو گا۔ ہم ایک شاندار کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یہاں ان دونوں نے شراب بھی پی تھی اور پرویز کے بضد ہونے پر میں نے ہی ان دونوں کو شراب بنا کر پیش کی۔ مجھے شراب بنانے اور پیش کرنے کا طریقہ اس نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ جب میں نے جھجک دکھائی اور کہا کہ میرے لئے یہ ناممکن ہو گا تو اس نے بڑی منت سماجت کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ وہ بھی ایسے کام پر لعنت بھیجتا ہے۔ لیکن جس شخص کے ہاں ہم جا رہے ہیں۔ اس سے ایک ضروری کام نکالنا ہے ..... بصورت دیگر ہمارا سارا بزنس تباہ ہو جائے گا اور ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ اس کے باوجود جب میں نے انکار کیا تو اس نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ضروری نہیں کہ جو چیز ہمارے یہاں معیوب ہو وہ دنیا بھر میں بری سمجھی جائے۔ تمہارے ممی ڈیڈی تو اتنے ایڈوانس ہیں انہوں نے کم از کم یہ تو بتا دیا ہوتا"۔

آخر وہ میرا محبوب تھا۔ میں نے اس کی ناراضی مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی اس معاملہ سے میرے ہونے والے شوہر کا کاروبار وابستہ تھا اس لئے مجھے یہ گناہ بھی ضمیر کی لاکھ ملامت کے باوجود بادل نخواستہ کرنا پڑا۔ شراب نوشی کے دوران وہ شخص اپنی ہوسناک نظروں سے میرا بھرپور جائزہ لیتا رہا۔ پرویز نے مجھے خاص طور سے وہ لباس پہننے کو دیا تھا جو وہ خود میرے لئے لایا تھا۔ نجانے لباس پہن کر بھی کیوں خود کو برہنہ محسوس کر رہی تھی۔

پھر پرویز تو باتھ روم کے بہانے باہر چلا گیا اور میں اکیلی اندر رہ گئی۔ پرویز کے باہر جاتے ہی اس نے مجھ پر دست درازی شروع کر دی۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ میں نے پہلے تو یہی سمجھا کہ یہ شراب کے نشے میں بہک گیا ہے اور اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب وہ قابو ہی نہ آیا تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی جہاں برآمدے میں پرویز کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔

"او نجمہ! تمہیں نجانے کب سمجھ آئے گی۔ آخر "پینڈو" ہی نکلی نا!!" .....

اتنا کہہ کر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ کیا تھا چھوٹا سا سینما ہال دکھائی دے رہا تھا۔

"یہاں بیٹھو"۔ اس نے مجھے ایک کونے میں رکھی آرام دہ کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ میں حیران و ششدر وہاں بیٹھ گئی۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ کیا کرنے والا ہے۔

کمرے میں موجود پروجیکٹر کا بٹن دبا کر وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اب پردہ سکرین پر ایک فلم چل رہی تھی۔

چند لمحوں تک تو میری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جب ذرا گرد و پیش کا احساس ہوا تو یکدم ایک جھٹکا سا لگا جیسے بدن کسی ننگی تار سے چھو گیا ہو۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سکرین کو گھورنے لگی جہاں اس کمرے کا ایک منظر نظر آ رہا تھا جہاں میں نے پرویز کے ساتھ تنہائی میں کئی راتیں گزاری تھیں۔ کمرے کے کسی خفیہ گوشے میں چھپے کیمرے نے میرے سارے گناہ سلولائیڈ پر محفوظ کر لئے تھے۔

کتنا ظالمانہ طریقہ ءواردات تھا ان لوگوں کا.....!

جوں جوں فلم چلتی جا رہی تھی' میری آنکھوں کے سامنے سے مختلف مناظر گزرتے جا رہے تھے۔ میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جلد ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ کوئی نادیدہ قوت زور زور سے میرے سر پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ کمرے کی ساری چیزیں گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں بے اختیار زور سے چلا اٹھی۔

"بند کرو!..... " خدا کے لئے اسے بند کرو"۔

"چلاتی کیوں ہو؟"..... اس موذی نے شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے کیمرہ بند کر دیا۔

"کمینے' کتے' ذلیل' دھوکہ باز"۔ نجانے دنیا جہان کے کون کون سے القاب سے میں نے اسے نوازا' لیکن وہ بے شرموں کی طرح مسکراتا رہا۔

میں پھٹ پڑی۔ بچوں کی طرح سسکیاں لیتی ہوئی اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ گڑگڑاتے ہوئے التجا کی اور خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ میرے پیٹ میں اس کا بچہ ہے۔ مجھ پر رحم کرے۔ لیکن "رحم" نام کے کسی جذبے سے شاید اس درندے کی آشنائی ہی نہیں تھی۔

"اگر میرے کہنے پر عمل کرتی رہی تو زندگی بھر عیش کرو گی' ورنہ یاد رکھو اس فلم کی درجنوں کاپیاں ہمارے پاس محفوظ رہتی ہیں۔

تم دنیا کے کسی کونے میں چلی جاؤ ہمارے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گی..... بیوقوف لڑکی! ہم بزنس مین ہیں۔ ہم صرف بزنس کرتے ہیں..... وہ خواہ انسانوں کا ہو خواہ جانوروں کا..... یہاں انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں..... یہ ہماری دنیا ہے..... اس کے قوانین الگ ہیں۔ تمہاری دنیا سے بالکل مختلف۔ سر جھکا کر ہمارے احکامات کی تعمیل کرتی رہو..... ورنہ یاد رکھنا تم اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکو گی"۔

شراب کے نشے میں دھت اس شیطان نما درندے کا قہقہہ گونجا.....

"تمہاری ملازمت برقرار رہے گی اور ہر ماہ پانچ ہزار روپیہ تمہارے ماں باپ کو پہنچتا رہے گا سال میں ایک بار چھٹی بھی۔ اور زمانے بھر کی سہولتیں' لیکن صرف تعاون کی صورت میں ورنہ!..... تمہارا پاسپورٹ ہمارے پاس

ہے۔ یہاں کوئی تمہاری فریاد پر کان نہیں دھرے گا۔ الٹا تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا یاد رکھو یہاں کی جیلوں میں ہی ساری زندگی گلتی سڑتی رہو گی۔ تمہاری ہوا تک کسی کو نہیں لگنے دی جائے گی اور جو حشر تمہارا ہو گا ہی۔ تمہاری بہن تمہارے ماں باپ سب بے گناہ برباد ہو جائیں گے۔!!"

"چپ کرو خدا کے لئے چپ کرو"۔ میں اس کے خوفناک لہجے سے سہم گئی۔

میں بہت بری طرح جکڑی گئی تھی۔ بظاہر آزاد لیکن اندر سے مکمل قیدی بے بسی سے میں سسکتی رہی۔ پھر جیسے میرے آنسو خود ہی خشک ہو گئے۔ اس دوران وہ شراب نوشی کرتا رہا۔ مجھ سے بالکل لاتعلق ہو کر..... پھر میرے خاموش ہونے پر بولا!

"شاباش اب سمجھی ہو۔ پہلے ہی سمجھ جاتیں تو اتنی تکلیف ہی نہ کرنی پڑتی..... " اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ مجھے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ سوچتی ہوں میں اس وقت پاگل کیوں نہ ہو گئی۔ آخر کون سی کسر رہ گئی تھی باقی۔ میں سحر زدہ سی اس کے پیچھے پیچھے کھنچی چلی جا رہی تھی۔

"رہا بچے کا معاملہ تو تم خوف نہ ہو اس کا علاج بخوبی جانتی ہو۔ اگر چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مکمل مدد کر سکتا ہوں..... "!! اس نے مجھے اسی کمرے میں جس سے میں نکل کر بھاگی تھی' دھکیلتے ہوئے کہا

بھرا اسکا زوردار قہقہہ میرے کانوں میں سیسہ انڈیلنے لگا۔

کمرے میں وہ شیطان پہلے سے میرا منتظر تھا میں تو بے جان لاش بن چکی تھی..... اس دہشت ناک حادثے نے میری حسیات کو جیسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ مجھے اپنے تن بدن کی پھر پرواہ جیسے تھی ہی نہیں..... !صرف یہ احساس تھا کہ میں زندہ ہوں۔ میری سانس اور دل کی دھڑکن چل رہی ہے..... اور بس..... !!

ساری رات وہ درندہ میری بوٹیاں نوچتا رہا۔ میں روتی رہی۔ اپنے نصیبوں کا رونا۔ سسکتی رہی۔ اپنے لالچی ماں باپ کا ماتم کرتی رہی اور تڑپتی رہی۔

پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا جب آنسوؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ کوئی رونا بھی چاہے تو رو نہیں پاتا۔

اپنے بس میں کچھ رہتا ہی نہیں.....!!

بے اختیار ہونے احساس اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ انسان لاشعوری طور پر خود کو مردہ تصور کر لیتا ہے..... اس کا بدن تو اپنا ہوتا ہے لیکن حرکات پر کنٹرول نہیں رہتا.....

کوئی نادیدہ قوت..... کوئی پراسرار طاقت اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور وہ جئے جاتا ہے۔

○

وہ قیامت کی رات تھی۔ جس نے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ جس نے مجھے واقعی عورت سے فاحشہ بنا دیا..... مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں انتہائی ذلیل ترین گھٹیا ترین مخلوق بن چکی ہوں

صبح پرویز مجھے خود ہی ہوسٹل چھوڑ آیا۔ یہاں وہ حرافہ میری منتظر تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔

"آئندہ ان کا کہنا مانتی رہنا تم بھی ذرا خیال رکھنا"۔ اس نے مجھے حرافہ کو سونپتے ہوئے کہا۔ جس نے مجھے قصائیوں کی طرح پکڑا اور اوپر لے گئی۔

"آرام کر لو تھک گئی ہو گی۔ اب تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی ہے جہاں جی چاہے گھومو پھرو' سیر کرنے کو جی چاہے تو مجھے بتا دینا ۔۔۔ "اس کی شیطانی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

تین چار روز بعد ہی میں نے اپنی زندگی کا بدترین گناہ بھی کر لیا اور اپنے پاپ کی نشانی کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیا۔

(۷)

چند ہفتے مجھے کسی نے نہ چھیڑا۔ اس دوران مجھے دنیا بھر کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ میرے ہاتھ کا لکھا خط "سنسر" ہونے کے بعد پوسٹ کیا جاتا تھا۔ اس دوران ماں کے خط بھی آنے لگے جو میری طرف سے اتنے پیسے ملنے پر بے حد خوش تھی اور میری "ترقی" کے لئے دعا بھی مانگتی تھی۔ اس ۔۔۔ نے اپنے روایتی انداز میں لکھا تھا کہ میری ساتھی نرسوں کو اس نے خاص طور سے بھیجا گیا پانچ ہزار کا ڈرافٹ دکھایا ہے۔ وہ سب جل بھن کر رہ گئی ہیں۔

یہی کچھ تو چاہتی تھی وہ۔

کئی دفعہ جی چاہا کہ عابدہ کو خط لکھوں' لیکن میں نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے نتائج کتنے ہولناک ہوں گے کیونکہ ابھی تک خوش قسمتی سے اس کا ایڈریس میں نے پرویز کو نہیں بتایا تھا۔ شاید قدرت نے اسے میری ماں کے شر سے محفوظ رکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

تندرست ہوتے ہی مجھے "کام" پر لگا دیا گیا۔ معمول کے مطابق ڈاکٹر کے ہسپتال پر وہیں میری راتوں کا معمول چکایا جاتا اور سر شام کوئی قیمتی کار آ کر مجھے "قربان گاہ" کی طرف لے جاتی جہاں کوئی نہ کوئی وحشی درندہ میری بوٹیاں نوچتا رہتا۔ صبح ہوتے پر وہی کار مجھے میری "خصوصی بخشش" سمیت میرے ٹھکانے پر واپس چھوڑ جاتی۔

ان لوگوں کی نگرانی مجھ پر بہت سخت تھی۔ میرے ہوسٹل سے ہسپتال تک آنے جانے پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ چھ سات ماہ بعد جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب شکار نکل کر نہیں جا سکتا تو انہوں نے قدرے ڈھیل دے دی۔ اب میں اپنی مرضی سے کسی لڑکی کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کر لیا کرتی تھی۔

ایک روز اسی طرح میں ایک سٹور میں داخل ہو رہی تھی کہ اس میں سے نوید برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔ چونکا نہیں۔

"اوہ تم۔ تو پہنچ گئی نہ بالآخر ٹھکانے پر "اس کے لفظوں کی کاٹ مجھے کھا گئی۔

"مجھے معاف کر دینا بھائی! میں نے تمہیں غلط سمجھا ..." میں سسک پڑی۔ ہم دونوں ایک کونے میں کھڑے تھے۔ یہ جگہ قدرے محفوظ تھی کم از کم گفتگو کرنے کے لئے۔

"خبردار"۔ وہ بھڑک اٹھا۔ "میں تمہارا بھائی اس وقت تک تھا جب تک تم باکرہ تھیں۔ اب میرا اور تمہارا رشتہ نہیں۔ میں ایک برا انسان تھا اس کے باوجود میں نے تمہاری بھلائی چاہی اور تمہیں سمجھایا کہ اس شیطان کے پنجے سے بچ جاؤ۔ الٹا تم نے میری شکایت کر دی ... میرا کیا بگڑا مس نجمہ! مجھ جیسے لوگوں کو کیا کمی ہے نوکریوں کی۔ ہاں تمہاری بات الگ ہے ... تم یاد رکھنا۔ تم قیامت تک اسی جہنم کا ایندھن بنی رہو گی۔ تم مرنا چاہو گی اور اپنی مرضی سے یہ لوگ تمہیں مرنے نہیں دیں گے ..." وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا۔

میں بے بسی سے سنتی رہی۔ پھر وہ میرا جواب سنے بغیر مجھے "خدا حافظ" کہہ کر چلا گیا۔ میں بدبخت آنسو بہاتی رہی۔ میری ساتھی جو ہوسٹل سے میرے ساتھ آئی تھی نوید کو "گاہک" سمجھ کر الگ جا کھڑی ہوئی تھی۔ نوید کے جاتے ہی وہ میرے نزدیک آ گئی۔

میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے کہا ... "کمال ہے! ابھی تک تمہارے آنسوؤں کے سوتے خشک نہیں ہوئے۔ بڑی خوش قسمت ہو۔ تمہیں رونا تو آ جاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ اب رو بھی نہیں سکتے"۔ اس کی آواز میں ایک عالم کی یاسیت سمٹ آئی تھی۔

"نجمہ! ..." اس نے میرا بازو بڑی ہمدردی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا ... "اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لو۔ ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا کہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے لٹنے کا تماشہ خود ہی دیکھتے رہیں"۔

"نہیں ..." میں نے بازو جھٹک کر الگ کر لیا۔

اس لمحے مجھ میں وہ نجمہ بیدار ہو گئی جسے پہلے روز سلوشن آرٹس کی کلاس میں دیکھ کر جنتی لاماؤں جیسی شکل والے انسٹرکٹر نے کہا تھا ... "مس نجمہ! تم بہت آگے نکلو گی"۔

"میں بے بسی سے یہ سب کچھ برداشت کروں گی؟"۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس لمحے مجھے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا کر لو گی تم؟" ... اس نے کھلی کھلی مسکراہٹ اچھالی۔

"میں اس موذی کا خون پی جاؤں گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے"۔ میرا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

"نجمہ! خدا کے لئے میری بہن! کبھی بھول کر بھی میرے علاوہ اور کسی کے سامنے اپنی زبان سے یہ الفاظ دوبارہ نہ نکالنا۔ اگر بہت بیمار ہو تو کسی کار کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لو۔ یا موقعہ ملے تو سمندر میں

ڈوب جانا" ... وہ بولی، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں خوف کی کی پرچھائیں لرزیں۔ میں نے اس سمت دیکھا جدھر وہ دیکھ رہی تھی ایک ہٹا کٹا مخلوط النسل عربی ایک کار سے اترتا نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ ہمارے گروہ کا کوئی گرگا تھا یا پھر ہماری نگرانی پر مامور کوئی کرائے کا کتا۔

میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہی چل دی۔ میرے اندر ہلچل مچی تھی۔ میرے لہو کا جیسے خمیر بدلنے لگا تھا۔ مجھے اپنے اندر ایک آگ دہکتی محسوس ہو رہی تھی۔

میرا جی چاہتا تھا اس مکروہ دنیا کو اس کے مکینوں سمیت اس کی آگ میں بھسم کر دوں ...

○

ہم دونوں ہوسٹل واپس پہنچ گئیں۔ اس رات میں نے ایک فیصلہ کر لیا کہ بھلے سے میں مر جاؤں لیکن میں پرویز کو بھی اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ وہ اس کے بعد مجھ جیسی کسی بدبخت کو اپنے جال میں پھنسا کر اس حال کو پہنچا سکے۔

کاش وہ مضبوط لمحات جنہوں نے مجھے اس لمحے انتقام کی طرف رہنمائی کی تھی ایسی گھڑیاں تب بھی آئی ہوتیں جب میں نے اپنے گناہوں کی تصویریں پردہ سکرین پر اپنی بدبختی کا نوحہ الاپتی دیکھی تھیں۔ تب میں کتنی کمزور پڑ گئی تھی ... اور اب میں کتنی بیمار ہو گئی تھی۔ مجھے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں رہی تھی کہ میرے والدین کا انجام کیا ہو گا یا خود میں کس انجام سے دوچار ہوں گی۔ میں نے اپنی موجودہ حیثیت اور ان خبیثوں کی طاقت کو بالکل فراموش کر دیا تھا جن کے چنگل میں بری طرح جکڑی گئی تھی۔

میں شعلہ جوالا بن چکی تھی۔

اب مجھے صرف اس لمحے کا انتظار تھا۔ اس مضبوط لمحے کا جب میں پرویز کو اپنی گرفت میں لے کر بھسم کر ڈالوں۔

کئی دفعہ جی چاہا کہ عابدہ کو خط لکھوں، اپنے دل کے پھپھولے اس کے سامنے پھوڑوں یا کم از کم اسے کوئی تحفہ ہی روانہ کر دوں۔ آصف کی خیریت جاننے کے لئے میں مری جاتی تھی ... لیکن یہ ناممکن تھا ... میں ایسا صرف سوچ ہی کر رہ جاتی۔ اسے کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اب مجھے اتنا موقعہ کم از کم ضرور میسر تھا کہ میں اسے چوری چھپے خط لکھ دوں لیکن یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ وہ خط پکڑا بھی جا سکتا ہے یا میرے منع کرنے کے باوجود عابدہ مجھے جوابی خط لکھ دے اور وہ میرے صیادوں کے ہاتھ لگ جائے۔ میں نے اپنی اس خواہش کا زبردستی گلا گھونٹ دیا۔

میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب موافق حالات کی منتظر تھی۔ سب سے پہلے مجھے ایک مضبوط سہارا تلاش کرنا تھا۔ کوئی ایسا شخص جو پرویز جیسا ہی ہو تاکہ اس کے ذریعے پرویز سے آسانی سے

نمٹ سکوں۔

وہاں موجود لڑکیوں کو ان لوگوں نے مختلف درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ میرا شمار پہلے درجے کی لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ جنہیں ان لوگوں کی غلیظ زبان میں "وی آئی پی" کہا جاتا تھا۔ ہمیں اعلیٰ حیثیت کے حامل انسانی درندوں کی خوراک بننا ہوتا تھا کیونکہ عام حیثیت والے تماش بین ہماری ایک رات کی قیمت بھی نہ چکا سکتے تھے اور مجھے انہی اعلیٰ حیثیت کے حامل درندوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا یہی اب میری زندگی کا مقصد اور مشن تھا۔

اس روز مجھے ہسپتال چھٹی ہونے سے پہلے ہی گاڑی لینے آ گئی۔ ایسا بھی کبھی ہوا کرتا تھا جب ہمیں کسی "خاص مہم" پر جانا ہوتا تھا۔ ہوسٹل کے دروازے ہی پر وہ بوڑھی فاحشہ میری منتظر تھی۔

"تھوڑا آرام کر لو اور اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔ آج بہت بڑی آسامی آنے والی ہے"۔

اس نے اپنے مکروہ چہرے پر چپکتی خباثت کو چار چاند لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا اور میرے ردعمل نے اس کی باچھیں کھلا دیں۔

ہوتا عموماً یہی تھا کہ میں ایسے "احکام" انتہائی بددلی سے موصول کیا کرتی تھی اور بادل نخواستہ اپنی بوٹیاں نچوانے جایا کرتی تھی لیکن آج ایک مسکراہٹ خود بخود سے میرے ہونٹوں پر چپک گئی جو اس بوڑھی حرافہ کے لئے نئی چیز تھی اور کسی حد تک چونکا دینے والی بھی۔

وہ صرف خوش ہی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہوا کہ اسے شک نہیں گزرا اور نہ درندے اس "خلاف معمول مسکراہٹ" کی اصلیت جاننے کے لئے ہنٹروں سے میری کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ یہ مناظر میں نے اکثر یہاں دیکھے تھے۔

شام ڈھلتے ہی ایک شاندار ایئر کنڈیشن کار مجھے لینے آ گئی۔ ایسی کاریں گو کہ یہاں عام تھیں لیکن مجھے آج پہلی مرتبہ ایسی کسی کار میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔ کار ایک جدید اور مکمل ایئر کنڈیشن محل نما عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ دروازے پر کھڑے مسلح پہرے داروں نے دروازہ کھولا اور تھوڑی دیر بعد میں ایک انتہائی پر تکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ میرے کسی بھی اشارے پر خدمت کی منتظر دو غیر ملکی خادمائیں میرے قریب دست بستہ کھڑی تھیں جب ایک ڈھلتی عمر کے شیخ کی آمد ہوئی۔

جی ہاں میں نے پہلی نظر میں اسے کوئی مقامی شیخ سمجھا تھا۔ اس نے مقامی شیوخ کی طرح ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ جس کو فرانس کی بہترین خوشبوؤں میں غسل دینے کے بعد زیب تن کیا گیا تھا۔ چہرے پر مقامی عربوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی۔ الو کی طرح گول گول ہوشاک آنکھیں اور شراب اور تمباکو میں رنگے ہوئے بادامی رنگ کے دانت لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے مسکرا کر اردو زبان میں کہا ..... "مجھے منصور کہتے ہیں"۔ ..... میرے دل سے آواز آئی یہی ہے وہ گدھا جس کا مجھے انتظار تھا۔

"جی باندی کا نام نجمہ" ..... میں نے مکمل عورت بننے کا مظاہرہ کیا۔ ایسی عورت جو منصور ایسے مردوں کی شدید ترین کمزوری ہوتی ہے۔ اس دوران مجھے بخوبی علم ہو چکا تھا کہ اس دنیا کے مرد کی کمزوری کیا ہے.....؟۔

میں نے منصور کی کمزور رگوں کو دبایا۔ اس سے بے تکلفی اختیار کی۔ اسے بتایا کہ وہ دنیا کا واحد مرد ہے جسے میں نے دل سے پسند کیا ہے۔ میں اس سے الگ نہیں رہنا چاہتی۔

منصور یورپ کا رہنے والا عرب تھا۔ ۔ جانے دنیا کے کتنے ممالک میں اس کے گھر تھے۔ اس نے آج تک عورت کا ایک ہی روپ دیکھا تھا۔ آج میں نے اسے کوشش کر کے دوسرا روپ بھی دکھا دیا۔

پہلی ہی رات میں نے اپنے ناز و ادا سے منصور کا دل جیت لیا۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میں نے اندازہ لگایا کہ اب یہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا.....

اور ایسا ہی ہوا۔

آئے روز میں اس کی خلوت سجانے لگی۔ بالآخر میں نے اس پر اپنی "خواہش" یعنی اس کی بیوی بننے کا اظہار کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ میری خواہش پر خوشی سے جھوم اٹھا اور مجھے اپنانے کے لئے سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بہرحال میں اس تماش کی عورتوں سے الگ تھلگ کوئی عورت تھی۔ پھر وہ مجھ سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا میں نے پہلی مرتبہ تو خود کو فاحشہ بنا کر اس کے سامنے پیش کیا تھا۔

پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جب میں منصور کی بیوی بن کر اس کے "حرم" میں داخل ہو گئی۔ جی ہاں میں تو اسے حرم ہی کہوں گی جہاں پہلے ہی مجھ ایسی کئی بدبخت آ اور جا چکی تھیں۔ میرے صیادوں نے میری قیمت وصول کر لی تھی اور منصور نے منہ مانگے دام چکائے تھے۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ منصور سے اپنے مستقبل کی کوئی گارنٹی طلب کر سکتی۔ میں "بکاؤ مال" تھی۔ ایک دکاندار نے منہ مانگے دام وصول کئے اور دوسرے کے آئے فروخت کر دیا۔ اب دوسرا جب چاہتا تیسرے کے ہاتھ بیچ ڈالتا۔

یہی تھی میری قسمت .....!۔

لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ منصوبے کا پہلا مرحلہ تو بخیر و خوبی طے پا گیا پچھلے دنوں سے میرا سلوک پرویز کے ساتھ بالکل بدل گیا تھا اور میں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں تو اب تک نادان ہی رہی ہوں اس زندگی کے مزے سے بالکل ناآشنا مجھے تو اپنی اہمیت کا احساس اب ہوا ہے یہ میرے منصوبے ہی کی ایک کڑی تھی۔

مرد کتنا بھی چالاک بنا پھرے لاکھ اپنے دانشور ہونے کا دعویدار ہو لیکن عورت کے ہاتھوں ہمیشہ کھلونا بن جاتا ہے میں نے بھی پرویز کو اپنی پیٹ میں لے لیا اور اسے اپنا "محسن" گردانا کہ اس کی وجہ سے مجھے تعیش اور کیف و سرور کے نئے جہانوں سے آشنائی میسر آئی ہے۔

میں نے اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ مجھے ضرور ملتا رہے گا کیونکہ میں اب بھی اس کی دوستی اور محبت کا دم بھرتی

ہوں ..... اور وہ میرے جھانسے میں آ گیا۔

جس شخص کی باقاعدہ داشتہ بن کر میں جا رہی تھی اس کی حیثیت کا احترام و اعتراف پرویز کو تھا اور وہ یہ بھی بخوبی جان چکا تھا کہ میں نے منصور کو اپنے حسن و جمال کے جال میں اس بری طرح جکڑ رکھا ہے کہ میری گرفت سے فی الوقت منصور کا فرار ممکن نہیں اس نے یہی سوچا ہو گا کہ ابھی تک میرے سر پر اس کی محبت کا بھوت سوار ہے اور وہ اسی "حوالے" کا سہارا لے کر میری معرفت منصور کا اعتماد حاصل کر کے مزید آگے بڑھ سکتا ہے۔

منصور کی کمپنی میں شمولیت اس کے لئے بہت بڑا اعزاز ہوتی بہت بڑا اعزاز

منصور کا کاروبار دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا تھا اس کا شمار بلاشبہ دنیا کے رئیس ترین لوگوں میں ہوتا تھا اور ایسے رئیس آدمی کی داشتہ اگر کسی کی "محبوبہ" بن جائے تو اس کی قسمت کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ پرویز نے یہی سوچا اور میں یہی چاہتی تھی کہ اسے ایسا سوچنے پر مجبور کر دوں اس درمیان میں نے ٹیلی فون پر اس سے رابطہ رکھا اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلاتی رہی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ موذی میرے جال میں مکمل پھنس چکا ہے جس طرح میں اس کے جال میں بری طرح پھنسی تو میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔

منصور کا اعتماد مجھے حاصل تھا میں اپنے خادموں کے ساتھ اپنی مرضی سے شاپنگ وغیرہ کے لئے جا سکتی تھی اس روز میں نے پرویز کو فون پر ایک ہوٹل میں ملنے کا وقت دے دیا اپنی ایک "خاص خادمہ" کی معیت میں شاپنگ کے بہانے میں خود کار چلا کر آئی اور بھوک کا بہانہ کر کے ہوٹل میں چلی گئی خادمہ کی یہ جرأت نہیں تھی کہ اپنی مالکن کے ساتھ ہوٹل میں جائے پرویز یہاں بے چینی سے میرا منتظر تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ بڑی مشکل سے کچھ مہلت نکال کر آئی ہوں اور ایک منصوبہ اس کے سامنے رکھ دیا اس منصوبے کے مطابق شیخ منصور کے کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات لے کر ہم دونوں کو فرار ہونا تھا اس کا طریقہ میں نے اسے ایسا خوبصورت بتایا کہ منصور جھوم اٹھا۔ میں نے اسے کہا کہ چند روز بعد شیخ منصور کچھ دنوں کے لئے فرانس جا رہا ہے سیف کی چابیاں میرے پاس ہوتی ہیں میں اس کی روانگی پر پرویز کو بلاؤں گی اور وہ ہیروں والا بریف کیس لے کر نکل جائے گا۔

اس کے بعد میری اور پرویز کی ملاقات پاکستان میں ہوگی وہ پاکستان پہنچنے پر مجھے اطلاع کرے گا میں اگلی فلائیٹ سے آ جاؤں گی اس منصوبے میں پرویز کو یقیناً یہی تاثر ملا تھا کہ میں بالکل بیوقوف ہوں اس نے یہی سوچا ہو گا کہ وہ ہیروں کا بریف کیس لے کر نکل جائے گا پھر کون سی نجمہ اور کون پرویز؟ ..... زندگی بڑے عیش و آرام سے گذار دے گا بعد میں جو مصیبت بھی آئے گی ظاہر ہے وہ میں ہی یہاں بھگتوں گی۔

پرویز جیسے ساون کے اندھے کو تو صرف آنکھیں درکار تھیں وہ فوراً رضامند ہو گیا اور میں واپس چلی آئی۔

علیحدگی سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا دل اپنی طرف سے بالکل صاف کر دیا تھا اور اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں تو اس کی احسان مند ہوں کہ اس کے ذریعے اتنی عیش و عشرت کی زندگی گذار رہی ہوں ورنہ تو شاید ساری زندگی نرس بن کر ہی گذارنی پڑتی۔

پھر ایک روز .....

میں نے پرویز تک یہ خوش خبری بھی پہنچا دی کہ شیخ منصور فرانس جا چکا ہے اور آج کی رات میں نے اس کے اور اپنے عظیم اور تابناک مستقبل کے نام وقف کر دی ہے۔

"تھینک یو مسٹر منصور ..... وہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"نجمہ کہو ..... پرویز! میں تمہارے لئے صرف نجمہ ہوں پلیز"۔

"اوہ نجمہ! بخدا میں تو پاگل ہوا جا رہا ہوں" ..... اس کی منافقانہ پکار گونجی۔

میں نے بھی اس کے لئے ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا اور اس رات گیارہ بجے کے بعد اسے ملاقات کا وقت دے دیا میں نے اسے بتایا تھا کہ منصور کی پانچ چھ روز تک واپسی کا کوئی امکان نہیں وہ خوش ہو گیا اور ہمارے درمیان رات اکٹھے بسر کرنے کا پروگرام بھی طے پا گیا۔ اور میں بڑی بے قراری سے اس جنس زدہ کتے کی منتظر ہو رہی۔

○

میں نے اسے منصور کے عالیشان محل نما مکان میں داخلے اور واپسی کا محفوظ طریقہ بھی بتا دیا تھا اور یہی وہ چاہتا تھا کہ پہرے داروں کی نظروں سے محفوظ رہ کر ہی یہ "کارنامہ" انجام پائے لیکن وہ بدبخت نہیں جانتا تھا کہ جس راستے سے اس نے داخل ہونا تھا اس پر دو خونخوار کتے اس کے استقبال کے لئے موجود تھے جو منٹوں میں کسی بھی اجنبی کی تکا بوٹی کر ڈالتے تھے ان کے منہ اس سے پہلے بھی انسانی خون لگ چکا تھا۔

آج پھر وہ اسی خون کی لذت سے آشنا ہونے جا رہے تھے!

رات گیارہ بجے تک کا وقت میں نے بڑے زبردستی نفسیاتی کھچاؤ میں گذارا انتظار کی شدت سے میرے اعصاب تڑخنے لگے تھے لیکن میں نے اپنی حالت پر قابو پائے رکھا۔ میری خدمت پر مامور خادماؤں نے مجھے رات کا کھانا کھلایا اور میں معمول کے مطابق اپنی خواب گاہ میں بھی چلی گئی۔

میری خواب گاہ کی مشرقی سمت کھلنے والی کھڑکی سے وہ سڑک بڑی صاف اور نمایاں دکھائی دیتی تھی جس سے ایک ذیلی سڑک اس محل نما مکان کی طرف آتی تھی ٹھیک گیارہ بجے ایک قیمتی کار وہاں چند سیکنڈ کے لئے رکی اور ایک سائے کو اگل کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی سائے کے قدم اسی طرف اٹھ رہے تھے بطور احتیاط اس نے پکی سڑک کو چھوڑ کر کھجوروں کے جھنڈ والا راستہ اپنایا تھا۔

میری دھڑکنیں خوشی اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے بے قابو ہوئی جاتی تھیں ایک مخصوص مقام پر رک کر میرے اشارے کا منتظر ہو رہا یہ اشارے ہمارے درمیان پہلے ہی طے پا تھے۔ میں نے کانپتے ہاتھ سے اپنے سرہانے رکھی ٹارچ اٹھائی کھڑکی کا پردہ سرکا دیا اور پیچھے ہٹ کر باہر کی سمت ٹارچ روشن کر کے بجھا دی۔

اول تو مجھے یقین تھا کہ کتوں کی موجودگی اور منصور کی خصوصی ہدایات کے تحت کوئی پہریدار اس طرف پھٹکنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا اگر اتفاقاً کسی نے اس طرف دیکھا بھی ہو گا تو اسے ٹارچ روشن ہونے کا احساس نہیں ہوا ہو گا یوں بھی یہاں کے ملازمین جانتے تھے کہ میں رات دیر گئے تک وی سی آر سے "دل بہلانے" کے بعد ہی بستر استراحت پر آتی ہوں

کھڑکی کا پردہ دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا پرویز نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا اور اب وہ سبک حرکت لیکن نپے تلے قدموں سے اس دروازے کی طرف آ رہا تھا جس سے گذر کر اس نے موت کی شاہراہ پر گامزن ہونا تھا۔

شدت جذبات سے میرا دم گھٹ رہا تھا کمرے کی ائیر کنڈیشن فضا کے باوجود مجھے اپنا جسم پسینے سے بھیگتا محسوس ہو رہا تھا دل کہ ماہی بے آب کی طرح پھڑکتے ہوئے جان کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرنے کو بے تاب تھا میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگی تھیں۔

اب وہ بیرونی دیوار کے بالکل نزدیک آ چکا تھا اتنا نزدیک کہ کھڑکی میں سے میرا ہیولا بھی اسے صاف دکھائی دینے لگے کتے دوسری طرف کہیں تاک میں بیٹھے تھے میں نے لرزتے قدموں دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے کھڑکی کھولی تو اسے اپنی جانب متوجہ پایا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دیوار پھلانگ کر اندر آنے کو کہا اور اشاروں ہی میں سمجھایا کہ میں اس کے استقبال کے لئے نیچے آتی ہوں پھر کھڑکی بند کی پردہ کھینچا اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی میری تمام حسیات قوت سماعت میں سمٹ آئی تھیں اور میں تڑختے اعصاب اور کپکپاتے جسم کے ساتھ کسی بھی آواز کسی بھی آہٹ کی منتظر ہو رہی۔

بمشکل ایک منٹ بعد ہی مجھے اس اعصاب شکن ماحول سے نجات مل گئی جب وہ ساعت سعید آئی اور میں نے ایک کتے کی زوردار غراہٹ پھر ایک کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ سنی شدت جوش وجذبات نے مجھ پر دیوانگی طاری کر دی تھی میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر کھڑکی تک پہنچی اور کھڑکی کھول کر باہر کو جھک گئی میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس نے میرے اندر دہکتے الاؤ پر جیسے بڑی آہستگی سے شبنم گرانا شروع کر دی۔

دونوں خونخوار کتے اس درندے کو بری طرح بھنبھوڑ رہے تھے کتوں کی غراہٹ اور اس کی بزدلانہ چیخوں نے مجھ پر نشہ طاری کر دیا جوش غضب سے میری مٹھیاں بھنچ گئیں میرے حلق سے نامانوس سی آوازیں خارج ہونے لگی تھیں پھر انہوں نے ایک مانوس آواز کی شکل اختیار کر لی

مارو... مارو اسے... اس کی بوٹیاں نوچ لو"..... میں بچوں کی طرح چلانے لگی۔

نشے کی یہ کیفیت بمشکل دو ہی منٹ برقرار رہ سکی پھر ٹوٹ گئی کیونکہ اب اس درندے کی مدافعت بھی دم توڑ گئی تھی ایک کتے کے دانت اس کی شاہ رگ میں گڑے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔

پہرے داروں کے وہاں پہنچنے تک اس کی لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی ان لوگوں کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی بلکہ معمول کی کارروائی تھی انہوں نے کتوں کو قابو کیا لاش کو ایک وین میں ڈالا اور وین فراٹے بھرتی وہاں سے چلی گئی اب کوئی گٹر یا گندی کا ذرہ اس لاش کا مقدر تھا۔

دو خادماؤں میرے کمرے میں چلی آئیں انہوں نے مجھے تسلی دی اور بے فکری سے لیٹ جانے کو کہا میرے بستر پر دراز ہونے تک وہ وین بھی واپس لوٹ آئی اور لوگ معمول کی سرگرمیوں میں لگ گئے۔

صبح اٹھتے ہی میں نے پیرس فون کر کے منصور کو اپنے خوف اور گھبراہٹ سے آگاہ کیا اس نے کمال محبت اور ہمدردی سے مجھے تسلی دی اور جلدی واپس آنے کا کہہ کر مطمئن ہو جانے بلکہ حادثے کو بھلا دینے کو کہا۔

دوپہر تک محل کی بیرونی دیواروں پر خاردار باڑ لگ چکی تھی جس میں رات کو بجلی کی رو دوڑائی جاتی تھی یہ سب کچھ صرف اور صرف مجھے مطمئن کرنے کے لئے منصور کے حکم پر کیا گیا تھا آخر میں اس کی چہیتی اور محبوب بیوی تھی اگلی رات کو وہ بھی پہنچ گیا۔

○

یوں تو میں نے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر لی تھی اور پرویز سے اپنی بربادی کا بدلہ لے لیا تھا لیکن رات والی کیفیت کا اب آہستہ آہستہ خاتمہ ہو رہا تھا اگلی رات منصور کے پہلو میں لیٹے ہوئے ایک بے نام سا خوف بھی میرے وجود میں در آیا تھا مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ وہ لوگ مجھے میرے ملک میں بدنام کرتے پھریں گے یا پھر پرویز کی موت کا انتقام مجھ سے لیا جائے گا میں ان تمام خطرات سے لاپرواہ ہو چکی تھی مجھے اگر ڈر تھا تو یہی کہ وہ ظالم میری ساتھی لڑکیوں پر بزاتشدد کریں گے وہ یقیناً یہی سمجھیں گے کہ اول تو وہاں ہوسٹل میں کوئی میرے ساتھ اس منصوبہ قتل میں شامل ہے اگر نہیں تو میرے ساتھ رہنے والی کو کم از کم میرے عزائم سے آگاہی ضرور تھی۔

گروہ سے متعلق کسی بھی بات کا علم ہونے کے بعد اسے گروہ کے کرتا دھرتا لوگوں تک نہ پہنچانا ایسا ناقابل معافی جرم تھا کہ ان پر ملنے والی سزا کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

اس رات میں نے منصور کو زیادہ شراب نوشی کروا کر جلدی "آؤٹ" کر دیا مبادا میرے منہ سے نشے کی حالت میں ہی میں کوئی غلط بات نہ نکل جائے۔ وہ جلدی ہی خراٹے لینے لگا پھر مجھے بھی نیند کی دیوی نے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

صبح جب منصور نے "میری طبیعت خراب دیکھی" تو اسے تشویش ہوئی میں نے اس کی "جدائی" کو اس

سبب بنا یا اور بلند ہوئی کہ وہ جہاں بھی جائے مجھے اپنے ساتھ رکھا کرے منصور اب میرے ہاتھوں کھلونا بن چکا تھا جس کا ثبوت تھا وہ بے تحاشا روپیہ جو اس نے آہستہ آہستہ میرے نام منتقل کر دیا تھا۔

میں نے اپنے جسم کی بے شمار زکوٰۃ اپنے والدین کے نام لگا رکھی تھی اور انہیں اتنا روپیا اور غیر ملکی سامان بھیجا تھا کہ وہ اب بلاشبہ اپنی بیٹی پر فخر کر سکتے تھے میں جانتی تھی کہ انہیں صرف یہی کچھ چاہئے تھا اس طرح کم از کم وہ لوگ "عابدہ کی ضرورت" سے تو بے نیاز ہو جاتے ورنہ ماکھے شاہ ایسے بدمعاش اور مکار شخص سے کسی بھی برائی کی توقع رکھی جا سکتی تھی اس دوران چاہتے ہوئے بھی میں کبھی اپنے وطن نہ آئی حالانکہ اب مجھ پر اس نوعیت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔

کبھی کبھی اچانک یاسیت کا دورہ مجھ پر پڑتا میں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتی تب آصف کی یادیں مجھے ماضی میں گھسیٹ لے جاتیں میں اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کبھی بھی اپنے ماضی کو خود سے الگ نہ کر سکی حالات نے مجھے گندگی کی جس دلدل میں دھکیل دیا تھا اب میں گھٹنوں تک اس میں دھنس چکی تھی پہلے شراب مجھے مجبوراً پینی پڑتی تھی اب یہ میری ضرورت بنے لگی تھی انسان جب پستی کی طرف اتنی تیزی سے اپنا سفر شروع کر دے اس کے بعد ضمیر نام کی کسی شے کا اس کے اندر باقی رہ جانا بڑا عجیب سا لگتا ہے۔

لیکن ..... اسے کیا کہیئے کہ جتنا فرار میں نے ان یادوں سے حاصل کرنا چاہا اتنا ہی میرے ضمیر نے مجھے احساس کی صلیب پر لٹکایا پچھتاوا ..... آصف کو کھونے کا پچھتاوا اب میری جان کو آنے لگا تھا میں نے اسے بھلانے کی جتنی کوشش کی اتنا ہی اس کی یادوں نے مجھے رگید امیرے پاس اپنی گم کردہ محبت کی نشانیاں چند خطوط کی شکل میں محفوظ تھیں امانت کی طرح میں نے ان کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا حسن اتفاق سے کبھی کسی کی نظر ان خطوط پر نہ گئی یا پھر ان لوگوں نے اسے درخور اعتنا ہی نہ جانا۔

میں سسک سسک کر جی رہی تھی اور جینا کوئی ایسا مختصر سا عمل نہیں تھا کہ کرب کی یہ گھڑیاں مختصر ہو جاتیں میں نے آپ سے شروع میں کہا تھا کہ بعض لوگوں کے لئے مر جانا ہی باعث نجات ہے اور بعض کے لئے زندگی باعث سعادت۔

(۸)

اگلے روز ہم دونوں رات کی فلائٹ سے پیرس روانہ ہو گئے گو کہ اب مجھے اپنی غلیظ دنیا کے اسرار و رموز سے کافی آگاہی ہو چکی تھی لیکن پیرس نے مجھے شہوت کے نئے جہانوں کی سیر کروا دی میں نے یہاں کے اجالوں اور اندھیروں میں انسانی ذلت کے وہ وہ مناظر دیکھے کہ مجھے اب خود کو انسان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی تھی۔

منصور کی شاید زندگی کا مقصد ہی شراب عورت اور دولت کا حصول تھا وہ اس تکون میں پھنس کر رہ گیا تھا اور میں اس تکون کا ایک اہم زاویہ تھی یہاں کے بظاہر چمکیلے اور سیک اپ کی تہوں میں چھپے کھوکھلے اور ناکارہ جسموں کے مقابلے میں میں بہر حال اس کے لئے "غنیمت" تھی میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ میرا بھرپور جسم ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور میں نے اس کمزوری سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا اسے جی بھر کے لوٹا میں واقعی راتوں رات کروڑپتی عورت بن چکی تھی یورپ کے بڑے بڑے بنکوں میں میرے نام کے اکاؤنٹ کھل چکے تھے۔

پیرس کے بعد پھر میں منصور کے ملک نہ گئی کیونکہ یہاں مجھے ابو عمار کی شکل میں منصور سے بھی بڑا گدھا میسر آ چکا تھا ستر اسی برس کے ابو عمار نے اپنے جسمانی ڈھانچے کو طاقت ور دوائیوں اور دولت کے سہارے گو کہ ابھی تک مضبوطی سے قائم رکھا ہوا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ یہ بظاہر مضبوط لیکن اندر سے کھوکھلی عمارت کسی روز بھی دھماکے سے پھٹے گی اور دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گی۔

ابو عمار منصور سے کئی گناہ بڑا حرام کار تھا۔ اس کے دبدبے اور رعب کا یہ عالم تھا کہ منصور ایسے کروڑپتی بھی اسے جوتے چاٹتے نظر آتے تھے۔ کسی تقریب ہی میں شاید پہلی مرتبہ اس کی نگاہ انتخاب مجھ پر ٹھہری تھی۔ میں نے اس کے آمد پر وہاں موجود ہوش و خرد سے بیگانہ شراب کے نشے میں مدہوش نیم برہنہ جسموں والی نام نہاد عورتوں اور مردوں کو اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تھا۔

اسے دیکھ کر منصور مجھے چھوڑ کر اتنی تیزی سے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لپکا جیسے وہ منصور کا کوئی پیر و مرشد ہے۔ ہر جنسی پتلی ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملانے کے لئے بے چین تھی۔ میں اپنی

جگہ بیٹھی چپ چاپ اپنے سامنے رکھے شراب کے جام سے دل بہلاتی رہی جب میں نے اچانک اسے اپنے سر پر کھڑے پایا۔

میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے وہ گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبائے کھڑا تھا میں اب چونکہ ایسے "حادثات" کی عادی ہوچکی تھی اس لئے اسے بھی معمول کی کاروائی جانا۔ ابو عمار میرے قریب ہی بیٹھ گیا اور ایک مؤدب ویٹر میں اس کے لئے وہیں وہسکی اور سوڈا لے آئی۔ یہاں کی نام نہاد اخلاقیات کی رو سے مجھے ابو عمار کے لیے بیگ تیار کرنا پڑا اور بقول اس کے میری ایک ہی جھلک نے اسے لوٹ لیا۔ "

ابو عمار نے اپنی دنیا کے دستور کے مطابق میرے منہ بولے دام چکائے اور مجھے اپنی بیوی نما داشتہ بنا کر امریکہ لے گیا۔ جہاں اس کا کروڑوں روپے کا کاروبار تھا۔ امریکہ لے جانے سے پہلے وہ مجھے ہنی مون منانے سوئٹزر لینڈ بھی لے گیا تھا۔ میں نے اس کے ذاتی جہاز میں سارے یورپ کی سیر کرڈالی۔ میں منصور کو دنیا میں سب سے امیر آدمی سمجھتی رہی لیکن یہاں منصور جیسے کئی گدھے قطار باندھے کھڑے تھے ابو عمار کو اپنی دولت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

ابو عمار منصور سے زیادہ سلجھا ہوا تماش بین تھا۔ اس نے مجھے بظاہر آزاد رہنے کے تمام مواقع بہم پہنچائے تھے اور مجھ سے باقاعدہ منصور کی طرح نکاح بھی کیا تھا..... لیکن میں اس جیسے جعلی نکاح کی حیثیت سے بخوبی آگاہ تھی اور جانتی تھی کہ میں کتنی کچھ آزاد ہوں۔

تین سال میں بوڑھے ابو عمار کی داشتہ بنی رہی۔ اس دوران اپنے ملک کو میں بالکل بھول چکی تھی۔ آصف کی یادوں کے کارواں میرے ساتھ ساتھ سفر کررہے تھے۔ اپنے لڑکپن کے اس حادثے سے میں کبھی جانبر نہ ہو سکی۔

ہر دوسرے تیسرے ہفتے کسی بھی گوشہ تنہائی میں میں اپنی زندگی کی شام غریباں سجاتی اور آصف کی تلخ یادوں کو شراب کے ترش ذائقے میں ڈبو کر نگل لیتی۔ فرار کی یہ کوئی آسان راہ نہیں تھی۔ مستقل شراب نوشی نے مجھے اب مستقل مریض بھی بنا دیا تھا۔ ہر دسویں پندرھویں روز کوئی نہ کوئی ڈاکٹر مجھے دوائیوں کا پلندہ تھما دیتا۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس کو لیا ہی نہیں تھا۔ دو چار روز میں دوائی کھاتی اور باقی دوائیاں پھینک دیتی۔

○

تین سال بعد ایک روز اچانک ابو عمار مر گیا۔ شراب نے اس کے پھیپھڑے ختم کر دیئے تھے۔ پہلے اس کا ایک گردہ نکالا گیا۔ پھر دل کا آپریشن ہوا پھر معدے کی باری آئی۔ شراب اور زناکاری نے اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ لیا اور ایک روز وہ سالخوردہ لکڑی کی عمارت کی طرح دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔

یورپ میں مجھ سمیت اس کی چار بیویاں تھیں۔ اربوں روپے کی جائیداد ہم میں بٹ گئی اور میں پلک جھپکتے کروڑ پتی بن گئی۔ اس کی وفات کے چند روز بعد ہی مجھے شادی کے پیغامات ملنے شروع ہوگئے۔ مجھ سے ہمدردی جتانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ لیکن میں نے اب باقی زندگی جو آہستہ آہستہ ختم ہوتی نظر آرہی تھی 'آزاد گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا..... اب میں کسی نئے سنہری جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھی۔

پھر اب زندگی کا مقصد ہی کیا رہ گیا تھا ..... سوائے مُردوں کی طرح زندہ رہنے کے..... یوں بھی میں تو کب کی زندہ درگور تھی۔

میرے نزدیک زندگی کی حیثیت کھلونے سے بڑھ کر کیا رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے زندگی نے مجھے کھلونا بنایا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے اس سے جی بھر کے کھیلا۔ اپنی رگوں میں خود زہر سمویا۔ شراب میری زندگی کا جزو بن کر رہ گئی۔ میں نے اکیلے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا اور خود کو شراب میں غرق کرلیا۔ میں نے سوچا یہ زہر اب قطرہ قطرہ ہی کیوں میرے اندر گرے۔ زندگی کی زہرناکیوں کے سامنے اب اس زہر کی حقیقت ہی کیا رہ گئی تھی۔ میں ایک طرح خود سے لاتعلق ہوچکی تھی!۔

میں نے چاہا کہ خود کو 'اپنے ماضی کو 'اپنے آصف کو بھول جاؤں.....

لیکن ایسا بھی کبھی ممکن ہوا ہے..... میرے پاس اتنی دولت تھی کہ اگر میں اسے جلانے بیٹھتی تو بھی موجودہ زندگی میں نہ جلا پاتی۔ اب میرے لئے والدین بھی اجنبی بن گئے تھے۔ میں نے انہیں بھلا دیا تھا۔ شاید ان کے احسانات کا قرض میں نے سود سمیت انہیں واپس کر دیا تھا۔

گزشتہ دو تین سال سے میرا گھر سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

میرا اپنا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ دنیا بھر میں میرے ٹھکانے تھے۔ میں ابو عمار کی داشتہ تھی۔ جب وہ مرا تو اس کے دو تین محلات بھی میرے حصے میں آگئے۔ میں شاخ سے ٹوٹے پتے کی طرح ادھر سے ادھر بھٹکتی پھرتی تھی۔

کبھی امریکہ 'کبھی یورپ 'کبھی مڈل ایسٹ 'لیکن وطن جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ آصف کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ پاکستان میں اچھی سروس سے منسلک ہے کبھی کبھی بہت جی چاہتا کہ اسے دور ہی سے دیکھ لوں۔ وہ کسی اور ہی کائنات کا باشندہ تھا اور میری وجہ دنیا اور تھی.....!

میں نہیں چاہتی تھی کہ میری زندگی کی نحوست کا سایہ بھی اس پر پڑے..... لیکن ایک خواہش ضرور تھی کہ کہ مرنے سے پہلے اسے ایک مرتبہ اس کے حالات سے آگاہی ضرور حاصل کرلوں۔

یوں تو میں نے سارے ہی ستم زمانے کے جھیل لئے تھے لیکن قدرت ابھی مجھ پر اور ستم آزمائی کرنا چاہتی تھی..... اس روز جب میں اپنے معالج کے پاس پہنچی تو وہ خاصا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے بین السطور

میں ایک مرتبہ اس نے میری اندر جنم لینے والی "خطرناک بیماری" کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن کھل کر بات نہیں کی تھی۔ اس روز جب میرے معالج نے مجھے شراب نوشی سے بھی پرہیز کرنے مشورہ دیا تو میں نے حسب سابق اس کی "نصیحتوں کا مذاق اڑانا چاہا لیکن ڈاکٹر بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"میڈم! آپ خود کو قتل کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ خدا کے لئے اپنے آپ سنبھالئے۔ آپ کے جسم میں اب شراب کو نذر کرنے کے لئے کچھ باقی نہیں بچا۔ اگر آپ نے فوراً شراب ترک نہ کی تو..... "اس نے بات نامکمل چھوڑ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

میں مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس آ گئی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر نے مجھ سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی میں نے کبھی اس کی نصیحتوں کی پرواہ کی تھی۔ لیکن اس روز نجانے کیوں ایک بے نام سے اندیشے نے میرے اندر سر اٹھانا شروع کر دیا۔ آپ شاید یقین نہ کریں اس لمحے مجھے ایک ہی خوف دامنگیر تھا کہیں میں آصف کو دیکھے بغیر نہ مر جاؤں؟ میں موت سے نہیں ڈرتی تھی۔ جو زندگی میں جی رہی تھی وہ تو لعنت کا طوق بن کر میرے گلے میں آ پڑی تھی۔ اس سے موت بدرجہا بہتر تھی۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے ملک واپس جانے اور آصف کو ایک نظر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

○

ایک سٹور کے سامنے میں نے شوفر گاڑی کو روکنے کو کہا اور کچھ شاپنگ کرنے کے لئے اتر گئی۔ میں ابھی کار پارکنگ ایریا سے بمشکل چند گز دور ہی نکلی تھی جب ایک آواز نے میرے قدم تھام لئے۔

"نجمہ!" ..... میری پشت سے کسی نے پکارا اور میں ٹھہر کر رہ گئی۔

جانے کس نے میری گردن واپس موڑی تھی۔ حالانکہ اس انداز تخاطب نے ہی مجھے بے جان کر دیا تھا۔ بالکل یوں جیسے کسی نے مجھ پر اسم اعظم پھونک کر مجھے پتھر کی عورت بنا ڈالا ہو۔

میرے سامنے آصف کھڑا تھا..... !میرا آصف! میری پہلی اور آخری محبت!

خدا کی پناہ! کیا دبلا ہو رہا تھا وہ..... لیکن اس کے چہرے پر نظر آنے والا نور کا ہالہ پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ کوئی بہت لمبی عبادت سے، کسی چلے سے فارغ ہو کر اچانک جنگل سے نکل کر میرے روبرو آن کھڑا ہوا تھا۔ ہلکے سے فریم کے شیشوں میں سے جھانکتی سوگوار آنکھوں سے برقا رو خارج ہو کر سیدھی نیزے کی تیزابی کی طرح میرے کلیجے میں ترازو ہو رہی تھی۔ بدھ بھکشوؤں جیسے چہرے والا آصف میرے سامنے زندہ اور تلخ حقیقت بن کر کھڑا تھا۔

"ہاں نجمہ بیگم! اب بتاؤ کہاں تک بھاگو گی" ..... کسی نادیدہ قوت نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے اپنی جان آہستہ آہستہ اپنے جسم سے نکلتی محسوس ہونے لگی تھی۔ خدا جانے مجھ اتنی طاقت کہاں سے آ گئی

کہ میں مکمل اس کی طرف گھوم گئی۔ بڑی مضبوطی سے میں نے اپنے پاؤں زمین میں گاڑ رکھے تھے اور میں اسے پاگلوں کی طرح دیکھتی چلی گئی۔ میں نے اپنے ڈگمگاتے جسم کو سنبھالا دینے کے لئے نزدیکی کار کا سہارا لے لیا۔

"نجمہ! کہاں چلی گئی تھیں تم..... تم نے کیا کیا نجمہ!..... تم نے تو مجھے مار ڈالا..... کیا گناہ کیا تھا میں نے نجمہ! تم! تم چپ کیوں ہو..... بولتی کیوں نہیں؟" وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں پتھر کا مجسمہ بنی اسے پلک جھپکائے بغیر گھورتی رہی۔

میں اسے کیا جواب دیتی۔ میری قوت گویائی سلب ہو چکی تھی سوائے بصارت کے اور تمام حسیات کو موت آ چکی تھی۔ بس میں اسے پاگلوں کی طرح دیکھ سکتی تھی۔

"آصف؟ تم"..... میں نے پوری قوت صرف کر کے اپنی ڈوبتی ہوئی نبض کو سنبھالا دیا۔ میرا حلق بند ہو رہا تھا

"اوہ شکر ہے "میرا نام تو یاد رہ گیا"..... اس کے لہجے میں اب کرب کے ساتھ طنز بھی سمٹ آیا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتی کہ وہ تو میری نس نس میں سمایا ہوا تھا..... میں نے اسے بھلایا ہی کب تھی

اچانک کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر زور سے بھینچا اور میں قریباً غش کھانے کی کیفیت میں ڈگمگا گئی۔ وہ گھبرا کر میری طرف بڑھا اور میں اس کی بانہوں میں جھول گئی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں میں نے اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک کا فاصلہ طے کیا۔ میرے مکمل ہوش میں آنے تک وہ میرے سرہانے کھڑا رہا۔ میرا ڈرائیور اسے کبھی اپنے ساتھ نہ لاتا اگر میں اسے اجازت نہ دیتی۔

○

آصف یہاں انجینئرنگ کی کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے حکومت کے وظیفے پر آیا ہوا تھا۔ آصف نے مجھ سے بہت کچھ کہا، بہت باتیں کی لیکن میرے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس سے کیا کہتی..... اسے کیا بتاتی..... مجھ پر بھلے کیسے ہی ستم ٹوٹے تھے لیکن میں اس کی مجرم تھی۔

میں بزدل عورت تھی..... بزدل مجرم اپنے جرم کے لئے دلائل نہیں دیا کرتے۔ وہ چپ چاپ اقبال جرم کر لیتے ہیں کیونکہ سزا ان کا مقدر ہے اور مقدر کبھی ٹلا نہیں کرتا۔ لیکھوں کے لکھے کو مٹانا انسان کے اختیار میں تھا ہی کب؟

میں بزدلوں کی طرح روتی رہی..... آنسو بہاتی رہی۔

"نجمہ! خدا کے لئے کچھ تو بولو..... کچھ تو بتاؤ..... میں تمہیں اب بھی اس حالت میں بھی قبول کرتا ہوں..... اب بھی لوٹ آؤ..... واپس آ جاؤ..... تم خود کو ہی نہیں مجھے بھی مار ڈالو گی۔"

میں برابر اس کی صورت دیکھتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی۔ وہ بچہ نہیں جانتا تھا کہ میں بری طرح لوٹی گئی ہوں۔ معاشرے نے جی بھر کے میری بوٹیاں نوچی ہیں۔ حالات کے شکنجے نے مجھے اس بری طرح جکڑا ہے کہ میرا دم گھٹنے کو آگیا۔

"تم بے گناہ ہو نجمہ"! یہ سب کچھ کسی اور کا کیا دھرا ہے جس کی سزا تمہیں مل رہی ہے۔ میں یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہیں اپنا کر ہی رہوں گا۔ خدا کے لئے اس سب کچھ کو "حادثہ" سمجھ کر بھول جاؤ۔ لوگ مر بھی تو جاتے ہیں۔ ان کے اعضا ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں بس یہی جان لو کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی جان لیوا حادثہ تھا جس سے تم بچ نکلی ہو۔"

میں تب بھی چپ رہی۔ جی چاہا کہ اسے کہہ دوں کہ وہ بھی میری اور اپنی محبت کو ایک حادثہ جان کر بھول جائے۔ ایسا ہی حادثہ جس سے کوئی بمشکل جانبر ہوتا ہے لیکن بہرحال زندہ بچ جاتا ہے۔

لیکن کہتا کہ میں تو مجرم تھی۔ بول نہیں سکتی تھی۔ اسے قائل کرنے کے لئے دلائل کا منطق کا سہارا نہیں لے سکتی تھی۔ ان عذاب ناک لمحوں سے مجھے ڈاکٹر نے نجات دلائی

"مادام کو زیادہ ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں مسٹر! معاف کیجئے۔"

"میں کل آؤں گا نجمہ! اور تمہیں اپنی ضد توڑنی ہوگی..... کل کے بعد تم" ... اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کی آواز بھرا گئی گلا رندھ گیا اور وہ روتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کی روانگی پر مجھے یوں لگا جیسے میں آسمان کی وسعتوں سے تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں غرق ہوتی جا رہی ہوں۔ ابھی تک آصف میرے اور غرقابی کے درمیان سد سکندری بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس دیوار چین کے درمیان سے ہٹتے ہی میں پٹخیاں کھاتی نیچے ہی نیچے ڈوبنے لگی اور اس سفر کا اختتام میری غشی پر ہوا۔

ہوش آیا تو میرے چاروں طرف مشینوں نے گھیراؤ کر رکھا تھا۔ دو مستعد ڈاکٹر اور ان کی نرسیں مشینوں کے ڈائل پر تھرکتی سوئیوں کو پڑھ رہے تھے۔ ایک سکرین پر لکیریں اور نقطے ابھرتے ڈوبتے دکھائی دیتے تھے۔

رات کو ڈاکٹر نے میری ایک سیکرٹری کے ہاتھ میں فلموں اور کاغذات کا پلندہ تھما کر مجھے مکمل آرام کرنے کے مشورہ دے کر ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میری سیکرٹری سر جھکائے جب میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے ٹپکتی یاسیت نے مجھے ان کاغذات پر لکھی رپورٹ سے بھی آگاہی بہم پہنچا دی۔

میرے بضد ہونے پر اس نے انکشاف کیا کہ مجھے کینسر ہو چکا ہے ہاں۔ ابتدائی درجے کا کینسر.....

"قابل علاج ہے مادام! آپ محسوس نہ کیجئے۔ پلیز۔ فار گاڈ سیک۔" ... اس نے وفادار ملازمہ کے فرائض نہیں بھلائے تھے

میں تب سے خاموش رہی۔ اس سے کچھ نہ کہا۔ بس اسی روز سے میں نے شراب چھوڑ دی۔ میں نے اسے

کہا کہ مجھے اکیلا چھوڑ دے وہ کمرے سے نکل گئی تو میں پھٹ پڑی۔ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر ٹوٹ کر روئی۔ اپنے مرنے کو ندامت، پچھتاوے اور محرومی کے آنسوؤں سے گیلا کر دیا۔ اس روز پہلی مرتبہ ایک لمبی مدت کے بعد میں خدا کے حضور جھک گئی۔

ساری رات دو ڈاکٹر اور میرا سیکرٹری کمرے کے باہر بیٹھے رہے اور صبح پو پھٹنے تک سجدے میں گری رہی میں اس روز اتار دی، اتار دی کہ دل کی ساری سیاہی اور من کی تمام میل کو میں نے آنسوؤں کے ذریعے آنکھوں کے راستے بہا دیا۔

صبح مجھے یقین ہو گیا کہ میرے اندر میری دادی مرحومہ نے نیا جنم لیا ہے تو میں اپنے کمرے سے باہر نکل آئی جہاں میرے ملازمین کی فوج ظفر موج ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ ساری رات میں نے اپنے آپ سے طویل جنگ لڑی تھی۔ میں نے فوراً خدا کے حضور گڑگڑا کر جہاں اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی وہاں یہ التجا بھی کی تھی کہ وہ آصف کو میرے گناہوں کی سزا نہ دے۔ آصف کے سامنے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ میرا عامل تھا۔ میں اس کی "معمول" تھی۔ میں جکڑ کر رہ جاتی۔ میں اب اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تو اس کے لئے بہت قربانی دے دی تھی جب میں "باکرہ" تھی۔ آج تو میرے پاس میری نسوانیت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی..... اب میں کیسے خود غرض ہو جاتی..... زندگی کے پچھتاوے سے چند لمحوں ہی کے لئے سہی نجات پانے کو ایک ہی "قربانی" کا ڈھکوسلا تو باقی تھا..... میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی.....

میں وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتی تھی.....

میں نے اپنی سیکرٹری کو سوئٹزرلینڈ کی فلائیٹ پر ٹکٹ بک کروانے کو کہا اور اپنے بیڈروم میں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

میری آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہوئی تو اپنے ہونے پر یقین نہ آیا۔ مجھ میں پہلے والی کوئی بات باقی رہ ہی نہیں گئی تھی۔ میں تو وہی دیہات کی سیدھی سادھی نجمہ بن چکی تھی جس کی دادی اماں اسے ساتھ مصلے پر نماز پڑھایا کرتی تھی۔ اور جس نے ماکھے شاہ اور اس کی مریدنی کے چنگل سے بچنے کے لئے مارشل آرٹس کی کلاس میں داخلہ لے لیا تھا۔

دوپہر کو آنکھ کھلنے پر میں نے سب سے پہلے ایک طویل خط آصف کے نام لکھا اور اپنے ڈاکٹر کے سپرد کر دیا کہ جب وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا اس کے کلینک میں آئے تو یہ خط اسے سونپ دے.....

اس خط میں میں نے اسے اپنی بربادی کے ایک ایک جانگداز لمحے کی کہانی سنا دی تھی۔.....

میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کے لائق نہیں رہی۔ میں نے اس سے محبت کے نام پر صرف ایک التجا کی تھی کہ وہ مجھے بھلا دے.....

زندگی کی ڈور ہاتھ سے نکلی جاتی تھی.....

میں سو ئیٹز رلینڈ گئی.....

اپنا سرمایہ اپنے ملک میں منتقل کیا اور یہاں چلی آئی.....

ارادہ تو یہی کیا تھا کہ اب کبھی وطن واپس نہیں جاؤں گی لیکن جی عابدہ کو دیکھنے کو بہت چاہا۔ سو میں پاکستان آگئی۔

میں ایئرپورٹ سے اکیلی عابدہ کے گھر پہنچی۔ مجھے اچانک دیکھ کر تین بچوں کی ماں عابدہ خوشی کے مارے سسکیاں لیتی مجھ سے لپٹ گئی۔ ابھی تک اس نے والدین کو اپنا پتہ نہیں دیا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ میرے والدین کراچی کی ایک جدید ترین آبادی میں منتقل ہو چکے ہیں اور لاہور انہوں نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ پولیس نے دونوں کو "بلیک لسٹ" کر لیا تھا۔

میرا جی چاہا کہ عابدہ کو کچھ بتاؤں لیکن اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا کہ اب یہی ایک ایسی ہستی تھی جسے میں اپنے رازوں اور وصیت کی "امین" بنا سکوں۔

میں نے روتی بلکتی اپنی بہن کو اپنے ماضی کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی۔ اس پر میری بیماری کے انکشاف نے "بے ہوشی" طاری کر دی لیکن جلدی وہ ہوش میں آگئی

ہم دونوں بہنیں جی بھر کے روئیں دونوں نے میرے نصیبے کا مشترکہ ماتم کیا میں نے عابدہ سے التجا کی کہ وہ میری بیماری کا راز کسی پر منکشف نہ کرے۔ اپنی خاصی دولت میں نے ڈیڑھ دو مہینے میں پاکستان میں منتقل کرا لی تھی اور وہ عابدہ کو سونپ دی تھی۔ اشفاق تک میری بیماری کی خبر بہرحال پہنچ گئی تھی۔ میرے حال پر وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں بہتر علاج کے کسی یورپی ملک چلی جاؤں۔ لیکن اب میں نے کہیں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مرنے کے لئے تو کم از کم میں اور کہیں نہیں جاؤں گی .....!

میں نے عابدہ سے کہہ دیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد مجھے دادی اماں کے پہلو میں دفنا دے۔ اس سے التجا کی ہے کہ آصف کو میرے حال زار کی خبر نہ ہونے دے۔ صرف میری موت کی اطلاع اسے دے دے۔

میں نے آصف کے نام اپنی آخری وصیت میں التجا کر دی ہے کہ وہ شادی کر لے تب ہی میری بے قرار روح کو سکون میسر آئے گا۔ ایک خطیر رقم میں نے اس کی ہونے والی بیوی کے نام شادی کے تحفوں کے لئے وقف کر دی ہے۔

اب میں خاصی مطمئن ہو گئی ہوں۔ ڈاکٹروں نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ میں مر جاؤں گی، لیکن مجھے نجات کی اس گھڑی کا شدت سے انتظار ہے جب میں ان سارے جھنجھٹوں سے یکسر آزاد ہو جاؤں گی۔

تبتی لاماؤں کی شکل والے انسٹرکٹر نے پہلے روز میرے تیور دیکھ کر پیشین گوئی کی تھی کہ میں بہت آگے نکلوں گی ..... میں اب بہت آگے نکل آئی ہوں اتنا آگے کہ میرے قدموں تلے بچھی زمین بھی اب مختصر ہونے

لگی ہے۔ یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں۔ یہ اختتام ہے اور اختتام کے الاؤ کی طرف میرا سفر تیزی سے جاری ہے۔ میں قسطوں میں مر رہی ہوں۔

آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے.....